

# عزیز گاہ

عزیز گاہ





نے شازیہ سے گفتگو کیا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے  
اٹاب میں سرپلا رہی تھی۔ شازیہ کو گرمی ضرورت سے  
زیادہ ہی لگتی تھی۔ وہ دو منٹ میں ہی پسینے میں شرابور  
ہو گئی تھی۔

”نھہو مجھے آگے جانے دو، تمہارا کیا ہے کسی اور  
گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگ جاؤ، پہلے  
بھی ایک بار ایسا کر چکی ہو۔“

گاڑیوں کی ایک لمبی قطار اور ادھر ادھر جاتے لوگوں  
کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس نے بلند آواز میں  
شازیہ کو مخاطب کیا اور آگے بڑھی مگر آگے بڑھتے ہی  
اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔  
قطاروں میں چلتی گاڑیاں جیسے ایک دم رک گئیں۔

دو گھنٹے تک دنیا کی ہر موضوع پر گفتگو کرنے اور  
سینڈویچز اور میٹلز کی ایک اچھی درائی سے لطف  
اندوز ہونے کے بعد وہ شازیہ کے ساتھ ایک خوشگوار  
موڈ میں ’سب دے‘ سے باہر نکلی تھی۔ باہر چمکتی  
دھوپ تھی اور آنکھوں کو چند حیلے دے رہی تھی۔  
ایم ایم عالم روڈ پر چہل پہل اور زندگی اپنے عروج پر تھی۔  
گاڑیوں کی لمبی قطاریں، ایک کے بعد ایک۔ روڈ  
کر اس کرنا مشکل تھا۔ آتے ہوئے بھی انہیں گاڑی  
پارک کرنے کی جگہ مشکل سے ملی تھی اور ’سب  
دے‘ سے خاصی دور۔

”لیویز کے پاس کھڑی کی تھی نا گاڑی؟“  
”جیند جشد“ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس

## ٹاؤلیٹ





مختلف راستوں اور موڑوں سے گزرتی ہوئی گاڑی اس لمبی استوری ٹاور کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو کر پارکنگ میں جا کر رک گئی۔ اور تقریباً سات منٹ کے بعد وہ اپنے پارکمنٹ میں پہنچ چکی تھیں۔



اس نے خالی کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ سب کچھ اپنی جگہ پر تھا ویسا ہی جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کا بیڈ، بیڈ پر پچھی لینن، اوڑھنے کی چادر، بیڈ روم چیر، سیٹی پردے، کٹن ڈارڈ روب، فرش پر پچھی رگ، بیڈ سائیڈ ٹیبلز، گھومتی نظریں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فوٹو فریم پر جا رکیں۔ اس فوٹو فریم میں اس کی تصویر جڑی تھی۔ مگر اسے لگا جیسے اس فریم سے تین منٹے مسکراتے چہرے جھانک رہے ہوں۔ ایک اکائی کے تین سرے، پھر اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر غور سے ان تین چہروں کو دیکھنا چاہا اور اسے محسوس ہوا کہ ان تینوں کے درمیان کہیں کچھ جگہ خالی بھی تھی یہ کچھ خالی جگہ آہستہ آہستہ ایک خلا میں تبدیل ہو گئی۔ مگر وہ تینوں چہرے پھر بھی خوش باش لگ رہے تھے۔ ہنستے مسکراتے ہوئے۔ یوں جیسے انہیں اس خلا کے ہونے کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا۔

”چٹاخ“ پھر جیسے کسی نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا اور اس نے بے اختیار اپنے گال پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنی نظریں اس فوٹو فریم سے ہٹائیں۔

اسی دوران اس کی نظر سامنے دیوار پر پوسٹر بورڈ پر لگی ایک اور فل سائز تصویر پر پڑی۔ یہ بھی اس کی اپنی تصویر تھی۔ ڈیپ ریڈ ٹاپ اور آسٹالکو جینز میں ملبوس اس نے یہ پورٹریٹ ”رولو“ سے بنوایا تھا۔ اس کا میک اپ شوخ تھا اور بال اسٹائش انداز میں بکھرے تھے۔ اس نے اینٹھیک جیولری پہن رکھی تھی اور اس کے بیک گراؤنڈ میں رنگ ہی رنگ تھے۔ وہ جدید دور کی ایک پرفیکٹ اسٹائل دیوا لگ رہی تھی۔ اس پورٹریٹ کو دیکھتے دیکھتے اس کا دماغ گھومنے لگا اور اس کے سارے رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگے۔ سرخ، پیلا، سبز، نیلا ان سارے گڈمڈ

لوگ، آوازیں، شور سب ختم ہو گیا اور ایک جامد سکوت فضا پر چھا گیا۔ بس متحرک رہ گئی تو۔ وہ تین ہستیاں جو ”جامن جاوا“ سے باہر نکل رہی تھیں اور ہستی مسکراتی دوسری سمت پارک کی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پھر وہ تینوں ایک جالی پچائی گاڑی میں بیٹھ کر کسی مانوس منزل کی طرف گامزن ہو گئیں اور اس گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ٹریفک رواں ہو گئی۔ ساکت گاڑیاں متحرک ہو گئیں، لوگوں کے رے قدم چلنے لگے، فضا میں منجمد ہوئی آوازیں اور شور پھر سے گونجنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی جیسے حال میں واپس آ گئی۔

”افوہ مارینہ! تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا، تم کیوں یہاں ہی رک گئیں، میں گاڑی تک جا کر واپس آئی ہوں۔ یونو گرمی کے مارے مجھے چکر آنے لگے ہیں۔ اور تم، تم یہاں کیوں رک گئیں، تمہیں تو مجھے گائیڈ کرنا تھا گاڑی کی طرف۔“ شازیہ کی جھٹلائی ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

اس کے چہرے سے سینے کے قطرے ٹپک رہے تھے اور اس نے ہاتھ میں نشو پیرز کا ایک ڈھیر پکڑا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ چونکتے ہوئے بولی ”چلو بس چلتے ہیں۔“ وہ مرے مرے قدموں سے چلتی شازیہ کے پیچھے آنے لگی۔

”مارینہ! سب ٹھیک ہے نا؟“ گاڑی میں بیٹھنے، اس کے رفتار پکڑنے اور اسے سی کی کوننگ پھیلنے کے بعد اطمینان کا سانس لیتی شازیہ نے سامنے دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”مجھے امید ہے کہ سب ٹھیک ہے۔“ پھر اس نے جیسے خود کو تسلی دینے کی خاطر خود ہی جواب دیا گویا وہ جانتی تھی کہ کچھ ایسا تھا جو ٹھیک نہیں تھا۔

”ہوں! اس نے بھی دنڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ اس کے لہجے سے ہی شازیہ کو یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ فی الوقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ باقی کا سفر اسی خاموشی میں گزرا۔ اور



ہوتے رنگوں کے درمیان ایک چہرہ صاف نظر آنے لگا یہ رنگ اس چہرے کی پہچان تھے گویا۔ اس نے داغ پر زور دینے اور یاد کرنے کی کوشش کی وہ چہرہ کس کا تھا۔

”بنبتو“ اسے کہیں سے آواز آئی ہاں وہ چہرہ یقیناً بنبتو کا تھا۔ بنبتو جو اوڈھنی تھی۔ اور سرخ پیلے نیلے ہرے رنگوں کے امتزاج والے کپڑوں میں ملبوس رہتی تھی۔ اسے لگا پورٹ میں موجود اسٹائل دیوانے سرخ نیلے پیلے اور سبز رنگوں کے امتزاج والے چیونٹ کے کپڑے پہن لیے ہوں اور اس کی ناک میں تختی اور کانوں میں بالیاں بازوؤں میں موٹے موٹے مشینک کڑے اور انگلیوں میں ڈھیروں ڈھیروں چمکنے لگے ہوں۔

اس نے اپنی آنکھیں میچ لیس اور بیڈ پر اوندھی گر گئی۔



وہ ایک مختصر سے گھر کا کیا مگر صاف ستھرا صحن تھا جس کے ایک کونے میں لگے نیم کے درخت کے نیچے وہ نیچے بڑے مصروف سے انداز میں اکیلی بیٹھی کھیلا کرتی تھی۔ وہ اکیلی تھی مگر اپنی دنیا میں اتنی مگن رہتی تھی کہ اسے اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوتا تھا نہ کسی سہاگھی کے ہونے کی آرزو اس کی خیالی دنیا بہت وسیع تھی۔ اس کے پاس چند پرالی گڑیاں تھیں مگر ان گڑیوں کے بہنے کے لیے اس کے پاس ڈھیر سارے کپڑے تھے جو اس کی اماں نے اسے وقتاً فوقتاً ہی کر دیے تھے۔ اس کے پاس گتے کے ٹکڑے پر سیٹ کیا اور شفاف پلاسٹک سے کور کیا ایک ڈاکٹری اوزاروں کا سیٹ بھی تھا۔ اور مٹی، چینی کے برتن بھی جو اس کے ابا جی گجرات کے میلے سے لائے تھے۔ اور پھر اس کے پاس ایک اور بہت یونیک کلکشن تھا، گھگھو گھوڑوں کا ایک وسیع ذخیرہ جن میں گھوڑے بھی اور گھگھو بھی، چولہے بھی تھے اور ہانڈیاں بھی تو بے بھی تھے اور ڈول بھی پرندے اور مور بھی، گھگھو گھوڑوں کا یہ ذخیرہ اس نے جمعرات کے جمعرات گاؤں بھر میں پھیرا لگا کر بیچنے

والی بنبتو اوڈھنی سے خریدتا تھا۔

بنبتو اوڈھنی گاؤں سے دور نہر کنارے موجود جھکیوں میں رہتی تھی اور جمعرات کے جمعرات گھگھو گھوڑوں کا نوکرا سر پر رکھے، تنکوں سے بنے بھس بھرے اور رنگین کانڈوں سے سجے بڑے گھوڑوں، سفینہ مچھلیوں اور ہتھ گاڑیوں سے بھرے جھیلے کو شانے سے لٹکائے ہاتھ میں چھوٹے چھانچ اور نوٹے چھانچ صحیح کرنے کا سامان اٹھائے گاؤں بھر میں آواز لگاتی پھرتی تھی۔

”گھگھو گھوڑے لے لو جی“ سفینہ بچی (مچھلی) آئی جی، جمع (چھانچ) ٹھیک کرالو جی۔“

بنبتو اوڈھنی کی یہ آواز گاؤں بھر کی لڑکیوں کے کان سننے کے منتظر رہتے تھے۔ اور ہم ہمارے بچیاں بالیاں اس کی اس آواز کو سن کر گلیوں میں جمع ہو جاتی تھیں۔ ان کے دل گھگھو گھوڑوں کے ڈھیر خرید کر اور سفینہ مچھلیوں اور تنکوں کے، اور کاٹھ کے رنگ برنگے گھوڑے خرید خرید کر نہیں بھرتے تھے اور وہ ہر جمعرات کو نئے سرے سے یہ سب چیزیں خریدنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ یہی حال اس لڑکی کا بھی تھا جو اپنے گھر کے کچے صحن کے کونے میں لگے نیم کے درخت کے نیچے گر تہا کھیلا کرتی تھی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن رہتی تھی۔

اس تہا لڑکی کا نام۔ اس کا نام اس کے پس منظر سے بالکل بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کا نام اس کی اماں کی شہر لاہور میں رہنے والی بڑھی لکھی بھابھی نے جو کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں نے رکھا تھا۔ اس کا نام مرینہ تھا۔ بہت بعد میں جب اس نے صحیح معنوں میں دنیا دیکھی تو اسے خیال آیا کہ اس کی ممانی نے یقیناً یہ نام کسی افسانے کی ہیروئن کا نام پڑھ کر رکھا ہوگا۔ خواتین کے کسی ناول کا ٹائٹل پڑھ کر یا پھر پی ٹی وی پر ان دنوں چلنے والے کسی پاپولر ڈرامے کی ہیروئن سے متاثر ہو کر جو بھی تھا اس کا نام اس گاؤں میں موجود لڑکیوں کے روایتی ناموں سے مختلف تھا اور وہ خود بھی گاؤں میں موجود روایتی ناموں والی لڑکیوں سے



بہت مختلف تھی۔

وہ اپنی جس دنیا میں گن رہتی تھی اس میں کبھی وہ ایک بڑی ڈاکٹر ہوتی تھی اور کبھی ایک بڑی دکان دار، کبھی اس کے پاس اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا چارج ہوتا کبھی بینک میں کام کرنے والی جو درخت کے پتوں کو پیسے بنا کر کیش کا کام بناتی، کبھی ٹی وی پر خبریں پڑھنے والی لڑکی کی طرح سر پر دیپٹہ جما کر الفاظ کو چبا چبا کر ادا کرتی۔ اور کبھی بجلی کے تار کا لبا بیکار ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ

کر گانا گاتی نور جہاں۔ اس کی فینٹسیز بھی خوب تھیں، اور یہ گاؤں کی باقی لڑکیوں سے مختلف اس لیے تھیں کہ اس کے گھر کا ماحول گاؤں کے باقی گھروں کے ماحول سے مختلف تھا۔ اس کی اماں گاؤں کے واحد پرائمری گریڈ اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں اور اپا جی نزدیکی قصبے کے ہائی اسکول میں سینئر ٹیچر تھے۔ ان کے گھر میں زندگی کی بنیادی ضرورت ایک پرانا روم کولر، گاؤں میں قدرتی گیس کی سہولت نہ ہونے کے سبب گیس سلینڈر اور دو دروازے کا چولہا، چھوٹی چھوٹی اشیاء اس کے گھرانے کو گاؤں کے دیگر گھرانوں سے ممتاز کرنے کے لیے کافی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر میں ضرورت مندوں کی ایک بڑی تعداد اکثر حاضر رہتی تھی خصوصاً ”گرمائی دہپنوں میں برف مانگنے والوں اور سرما کی سپروں میں ایلوں کے اشاک سے چند ایلے مانگنے والوں کی۔

اس کی اماں اگرچہ گاؤں والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے سبب ہر دل عزیز تھیں مگر اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ زیادہ میل جول سے منع کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ عام لڑکیوں کے ساتھ میل جول اس کی تربیت اور تعلیم کے ایک سے تسلسل میں رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ یوں اس نے اپنی ایک علیحدہ دنیا بسالی۔ گاؤں کی دیگر لڑکیوں اور اس کے مزاج میں صرف ایک ہی بات میں مماثلت تھی اور یہ مماثلت بنتو اذہنی کی آمد پر سرخوشی کے عالم میں گھر کے دروازے تک بھاگ کر جانا تھی۔

پورا ہفتہ وہ لاشعوری طور پر بنتو کی آمد اور اس کی

کراری آواز کی منتظر رہتی اور اس کی آمد پر اس کا دل بے اختیار جھوم اٹھتا۔ پورا ہفتہ اپا جی سے ملے کر جمع کی ہوئی چوئیاں اٹھنیالیاں اس نے رومال کے کونے میں باندھ کر رکھی ہوتی تھیں۔ اور بنتو کے سامنے رومال کھول کر وہ پیروں کے بل بیٹھ جاتی۔ بنتو حساب کتاب کی ماہر تھی۔ خوب اچھی طرح پڑا ل کرنے کے بعد وہ چوئیاں اٹھنیوں کے اعداد و شمار سے دیتی اور پھر یہ بھی بتاتی کہ ان پیسوں میں وہ کیا کیا لے سکتی ہے۔ کتنے گھگھو گھوڑے اور تنکے سے بنے ہوئے کتنے کھلونے، وہ اپنی پٹاری گھگھو گھوڑوں سے بھر لیتی اور بدل بدل کر تنکوں اور بھس بھرے آٹمنج کی خریداری کرتی۔

بنتو کو نجانے اس گھر سے ویسے ہی زیادہ انیسیت تھی یا اسے یہ باقی لوگوں سے زیادہ کھانا پیتا گھر انہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں زیادہ وقت گزارنا پسند کرتی تھی۔ اماں کے ٹوٹے چھانچ مرمت کرتی یا پھر اپنے ساتھ لایا ساز و سامان انہی کے صحن میں کھول کر بیٹھ جاتی اور لوگوں کے مرمت طلب چھانچ وہیں بیٹھ کر مرمت کرتی۔ یہ منظر مرینہ کو بہت دلچسپ لگتا جب بنتو کی چاندی اور رنگ برنگ پلاسٹک کے چھلوں سے بھری پتلی ٹکرکالی رنگت والی انگلیاں تنکوں اور مرمت کرنے والے سوتے اور خاص میٹرل کے دھاگوں سے نبوہ آزما ہوتیں۔

وہ مہارت سے تنکے جوڑتی، سائینڈوں پر تنکوں کے چھوٹے گٹھے لگاتی اور چھابجوں کو مخصوص شکل دیتی جاتی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے سر پر رکھی رنگ برنگ ڈیزائنوں والا چادر نمادینہ اتارتی، اپنے چہرے پر پھیرتی اور اماں سے اپنی مخصوص زبان اور لہجے میں مخاطب ہوتی۔

”ہے کوئی روٹی پانی پی صیب“ ملنے والے کھانے نوں کو چھ۔“ (ملے گا کھانے کو کچھ)

اماں گھر میں ادھر ادھر کے کام کرنے والی ملازمہ ماسی سلیہ کو اشارہ کرتیں اور لیا جھپ روٹی کے اوپر کوئی ترکاری، اچار یا کبھی صرف شکر اور دسی گھی رکھ کر لے



آئی۔  
اتنے میں بنتو معن میں لگے ہینڈ پمپ کو چلا کر  
شفاف پانی سے اپنے ہاتھ، چہرہ اور پاؤں دھو کر دوپٹے  
سے خشک کرتی واپس اماں کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔  
ذرا سی ترکاری یا اچار کے چھوٹے سے آم یا سوڑے  
کے ساتھ خاصی بڑی روٹی نمٹاتی، بنتو کو دیکھنا بھی  
مریضہ کے لیے ایک دلچسپ منظر ہوتا بلکہ شاید اس کا  
پسندیدہ ترین منظر تھا۔

دو دو چار بھندڑیوں میں طے اکا دکا پاز نمناں اور ہری  
مرچوں کو اٹھتی پٹتی روٹی کے ٹوالوں میں لپیٹتی نکھاتی اور  
ساتھ ساتھ اماں سے اپنے دھڑے بھی روٹی جاتی۔  
اس کا خاوند نشہ تھا اور کام چور نکھاتا وہ اسے کما کر  
کھلانے کے بجائے اس کی کمائی اور محنت پر پیش کرتا  
تھا۔ جی بھر کر اسے پیتا اس کے تھکے بارے وجود سے  
اپنی پیاس بجھاتا۔ کھاتا پیتا اور نشہ لے کر پینک میں پڑا  
رہتا تھا۔ بنتو مٹی کے ٹکھٹو گھوڑے بناتی، بھٹی میں  
انہیں پکاتی، تنوں کے جانور اور دیگر اشیاء بناتی، چھانچ  
جوڑتی اور ہنست بھر بعد اپنا ساز و سامان اٹھائے گلی نکلی،  
گاؤں گاؤں صد اگاتی کمائی کرتی رہتی۔ وہ کمائی جس کا  
آٹھ سے زیادہ حصہ اس کے ٹکھٹو خاوند کے نشہ  
کاغذ ہنسنے والی ہوتی۔

”مارا کر کم بخت کو نیچے ڈھا کر ڈیڑھ پسلی کی توجان  
ہے اس میں۔“ ماسی سلیمہ ادھر ادھر کام کرتی بنتو کو  
مشورے دیتی۔

”ہائے آئے آیاں جی، مردوں ڈھائیں کے تے مار  
کے بہشت تہا کیس راں جاں ساں ایسہ دسوں  
مینوں یہلاں۔“ (مرد کو گرا کر مار کر جنت میں کیسے جاؤں  
گی یہ بتائیں پہلے، مجھے ذرا) بنتو اس مشورے پر الٹا  
سوال کرتی۔

”ایسے تو توجنت میں بس پہنچی کہ پہنچی۔“ ماسی  
سلیمہ مسخر اڑاتی ”کبھی خدا رسول کو بھی یاد کیا تو نے؟“  
”اوجی کیوں نہیں۔“ ”بنتو روٹی کی پلیٹ نیچے رکھ کر  
اپنی پٹیلے بھری انگلیاں موڑ کر ہونٹوں سے چومتی اور  
آنکھوں سے لگا لیتی ”کلام نہ پڑھنا آوے مینوں، پر“

کلام پاک دیاں سطران استے انگلی پھیر دی جاندی گواہی  
تہا رندی ناں میں ایسہ اللہ سوئے وا کلام آتے  
نالے محمد پاک رسول اللہ دے اتے اترا، لی لی صہب  
گو اپہاں آگے جاؤن کہ نہ جاؤن۔“ (کلام تو پڑھنا مجھے  
نہیں آتا مگر اللہ کے پاک کلام کی آیتوں پر انگلیاں  
پھیرتی ہوں اور گواہی دیتی ہوں کہ یہ میرے سوئے  
رب کا کلام ہے اور پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ  
علیہ وآلہ وسلم پر اترا ہے۔ لی لی صاحب گو اپہاں آگے  
جائیں گی کہ نہیں جائیں گی اللہ تعالیٰ کے پاس)  
”کیوں نہیں کیوں نہیں۔ اس میں کوئی شک  
نہیں۔“

اماں بھی اپنی انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگا لیتی  
اور ماسی سلیمہ کو گھورتے ہوئے کوئی اور گواہی افشانی نہ  
کرنے کا اشارہ کرتیں۔

بنتو کھانے کا سلسلہ دوبار شروع کر دیتی اور وہ اپنی  
حیران سنجستس آنکھیں کھولے اسے دو تین  
بھندڑیوں یا دو چار آلوں یا ایک دو لہسو ٹوں، کبھی آم  
کے اچار کی چھوٹی سی پھانک کے ساتھ روٹی بٹاتے  
ہوئے دیکھتی رہتی۔ اس دعوت شیراز سے فارغ  
ہونے کے بعد یا آواز بلند اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی۔

”شکر پاک خدا دا جنہیں ڈھل دی اک بجھائی۔ شکر  
لی لی صہب دا جنہیں سوا لیوں نانہ کیٹی ایسہ (شکر اللہ  
پاک کا جس نے پیٹ کی بھوک بجھائی۔ شکر لی لی  
صاحب کا جس نے مجھ سوا لی کے سوال کو رو نہیں کیا)

پھر وہ ہاتھ دھو کر کلی کرنے کے بعد اپنا بکھر اسلامان  
سیمٹی اسے سلیقے سے ٹوکرے اور جھیلے میں رکھتی  
اور ٹوکرہ سر پر نکا جھیلہ شانے سے لٹکا کر ایک ہاتھ  
ٹوکرے پر جما کر دوسرا ماتھے تک لے جا کر اماں کو  
سلیوٹ نما سلام کرتی اپنے آپ سے باتیں کرتی  
دروازے سے باہر نکل جاتی۔

مریضہ کافینسٹی ڈرامہ اس کے باہر نکل جانے کے  
ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔ اور وہ تازہ خریدے ٹکھٹو  
گھوڑوں اور بکھس بھرے جانوروں کی طرف متوجہ  
ہو جاتی۔ جن کی شکلیں اتنا ہانوس نہیں کہ وہ آنکھیں



بند کر صرف ہاتھ لگا کر دیکھتی تھی کہ اس کا ہاتھ کس چیز پر تھا اس کا پس چماتا تو گھر میں موجود سارا پیدا ہوا آٹا مٹی کو بے کراں سے اس کا کھوکھو ٹپوں سے گھر سارا ڈھیر کر دیتا۔ مگر لال اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھیں۔ اور یوں وہ انکی کچھلی ساری کلکٹھن سے اکیلے بیٹھی بیٹھی رہتی۔

وہ اپنی لال کے اسکول ہی میں پڑھتی تھی۔ مگر گھر میں اس کا نصاب مختلف تھا جو اس کے لالائی کسی انگلش میڈیم اسکول کی بیک شاپ سے لے کر آتے اور خاص میں طور سے اسے خود پڑھاتے تھے۔ یوں وہ دونوں طرح کے نصاب میں حلق ہو رہی تھی اور گاؤں پھر کی جاتی لڑکیوں سے مختلف مزان اور دماغ رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کے چوبدری صاحب اور فیصلہ دار صاحب کی بیٹیوں سے بھی جو اس کی طرح لال کے اسکول ہی میں پڑھتی تھیں۔

اس کی تھانویہ میں پچھلے سلطان خالد نے پچائی تھی جو اس کی اکلوتی خالہ کا بیٹا تھا اور ایک بار جب وہاں چچا چچاں درجہ میں پڑھ رہی تھی پہلی بار ان کے ہاں گریسوں کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ عجیب لڑکا تھا وہ بالکل جنوں کی صفات والا۔ اس کی خالہ پنڈی میں رہتی تھیں اور ایک غریب سے لال کے اس اصرار کے باوجود کہ وہ لوگ ان کے ہاں آکر رہیں صرف اس لیے لوہر آنے میں متامل تھیں کہ لال گاؤں میں رہتی تھیں۔ مگر اس سال مرینہ نے سنا تھا کہ خالہ اپنے اکلوتے بیٹے کی فرمائش سے مجبور ہو کر لوہر رہنے آئی تھیں۔

”ہا“ عائشہ نے سنا تو اپنا دہنہ منہ پر رکھتے ہوئے شدید حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ابھی تو میٹرک کارڈ لٹ بھی نہیں آیا اور تمہاری شادی ہونے لگی ہے۔ تم تو کبھی نہیں کلچ میں پڑھوں گی؟“

سنی کر لال لگا دہنہ سر سے سرکائے پھچک پھچک کر روئی اس کی دوست نے لال سرخ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے شاید اپنے دعوے یاد آئے تھے یا پھر ملیا میٹ ہوتے خواب اس نے کر لال لگا دہنہ اس کے چہنچہ کی پروا کیے بغیر دوبارہ آنکھوں پر رکھا

اور پھر رونے لگی۔

باب تو اکثر لوگوں کے مریاتے تھے مگر اس کا باب کیا مرا۔ اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس کے رونے چلانے کا کوئی قاعدہ نہیں ہوا اور دونوں میں اس کی پہلی تیار کر دی گئی۔ اس کی ماں کو بھولی ہوا تھا کہ اب زندگی کا نزدیک بدلے کا وقت تھا۔ خواب ’تور ش‘ شوق ’خوابشات‘ سب کا وقت ختم ہو چکا تھا یا پھر شاید وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ بہت آگے نکل گئی تھی۔

”کچھ تو یہ تم ہو۔“ اس خوش شکل موٹے اپنے سامنے ٹھہری لڑکی کو ستائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ ”جج ہے تم سدا بہار کے پورے کی مانند ہو کل بھی ایک کھلا ہوا پھول تھیں آج بھی ہو اور آنے والے کل میں بھی ایسی ہی رہو گی۔“

”تم بھول رہے ہو۔“ لڑکی نے اسٹاک سے اپنا دہنہ شلے پر بجاتے ہوئے کہہ ”میرے چچھے کل اور آج میں نکلن آسمان کا فرق ہے۔ میں آج وہ کسی طرح سے بھی نہیں نکلتی جو میں کل تھی۔“

”تمیں حسن کی بات کر رہا ہوں۔ وہ حسن جو کل معصوم تھا۔ آج قدرے خود آگاہ اور مغرور سا نظر آ رہا ہے۔ حسن کی جھک میں بھلے فرق آگیا ہو حسن اپنی جگہ موجود ہے۔ سدا بہار۔“ مرو نے اس کے قریب آتے ہوئے اسے شانوں سے تھام لیا اور اس کے خوبصورت چمکدار باہن کو پیوم لیا۔

”یہ تمہارا حسن نظر ہے ورنہ بندی کس قہطل ہے۔“ لڑکی شوخی سے بولی اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی آواز سے جیسے ہر طرف جلتی رنگ سانج اٹھا تھا۔

”مجھے اپنے انتخاب پر باز ہے اور اپنے مشاہدے پر فخر ہوگا اس فیصلے کو میری جلد بازی پر محمول کرتے تھے اور جذباتی قرار دیتے تھے۔ وہی لوگ اب سوچتے ہوں گے کہ میں نے نقصان کا سودا ہرگز نہیں کیا تھا۔ یہ تو وہ سودا ہے جس کا منافع ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔“ مرو نے ڈرنگ ٹیبل سے پر فیوم اٹھا کر اس کے اوپر اسپرے کرتے ہوئے کہہ



لیے ہی تو بانٹی جاتی ہے کھیر۔ ”وہ لپاپ ٹھوٹھیاں ختم کرتے ہوئے مرنے کے ناک بھوں چڑھانے پر بصرہ کرتے ہوئے کہتا۔

ماسی سلیمہ کے ساتھ شمو بھسارن کی بھٹی کا چکر لگاتا اور واپسی میں اپنی جھولی میں گنتی کے بھٹے ہوئے دانے اور بھٹے چاول سمیٹ لاتا۔

”توبہ! کتنے گندے ہو تم، کوئی پلیٹ پیالہ لے جاتے، یہ کیا کہ اپنی قمیص کے دامن میں ہی بھر لائے۔“ مرنہ نخوت سے کہتی۔

”ہاں سب لوگ ایسے ہی لارہے تھے۔ میں نے سوچا اس کا طریقہ یہ ہی ہوگا، اس لیے میں نے بھی ایسا ہی کیا۔“ وہ مزے سے دانے چباتے ہوئے کہتا۔ ”ہر کام اس کے مخصوص طریقے سے ہی کرنا چاہیے ورنہ اس کے کرنے میں مزا نہیں آتا۔“

غرض کچھ ہی دنوں میں وہ گاؤں کے معمول میں یوں غرق ہوا جیسے اسے یہیں رہنا ہو۔ واپس کبھی نہ جانا ہو۔ اس صورت حال نے خالہ کو بوکھلا دیا۔ وہ انتہائی محنت اور توجہ سے اسے زندگی کے قرینے اور ڈھنگ سکھا رہی تھیں اور لڑکا اپنے جتنی معمولات کے زیر اثر ان کی ساری محنت غارت کیے دے رہا تھا۔ سودہ جھٹ پیٹ ٹکٹ منگا، سامان باندھ واپسی کی تیاری کرنے لگیں۔ اس روز جب انہیں واپس جانا تھا مرنہ کو سلمان خالد کا لٹکے ہوئے چہرہ اور اس شکل پر ہنسی آتی رہی۔

”بے چارہ۔“ اس نے دل میں سوچا تھا۔

سرخ، پیلے، نیلے اور سبز رنگوں کے ترمے دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہے اور اس کے کانوں میں مدت کے بعد ”بنٹو اوڈھنی“ کی آواز گونجتی رہی۔ بنٹو جسے ماسی سلیمہ ہمیشہ مشورہ دیتی رہی کہ اپنے نشی خاوند کو جو اسے چار چوٹ کی مار مارا کرتا تھا اور اس کے کماے میں سے چھین کر اپنا نشہ پورا کرتا تھا کو یا تو چھوڑ کر چلی جائے یا پھر اس منجھنی مرل شخص کو نیچے گرا کر خوب مارے مگر جو اپنے زخم دکھائی اپنے محنت کش کھر دے کئے پھٹے ہاتھوں سے کو بیہوش

”بس کرو۔“ میں پہلے ہی بلاؤی اسپرے اور پرفوم میں خود کو اچھا خاصا ”بھگو چکی ہوں۔“ لڑکی نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے کیے گویا پرفوم کے اسپرے سے بچنا چاہتی ہو۔

”تم یونہی اچھی لگتی ہو، خوشبو کے جھوٹے کی مانند جس کا اثر دماغ پر تھمارے جانے کے بعد بھی رہتا ہے۔“ مرنہ نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹالی کی ٹانگ کو درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور وہ لڑکی گنتی ہی دیر آئینے میں نظر آتے اس کے مضبوط اور خوبصورت سراپے کو دیکھتی رہی۔ وہ کتنا وجہ تھکا، کتنا ہنڈ سم۔ اس کا لباس ہمیشہ اعلیٰ معیار کا ہوتا تھا اور اس کے ذوق کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ جو بھی پہنتا اس کو سوٹ کرتا تھا یا پھر شاید اس کی چوائس اتنی محتاط ہوتی تھی کہ وہ وہی پہنتا تھا جو اسے سوٹ کرتا تھا۔ اس لڑکی کو اس مرد سے عشق ہونے لگا تھا۔ اس کے وجود سے بھی اور اس کے دل سے بھی۔

مرنہ کو اپنی اکلوتی خالہ کے اس اکلوتے بیٹے کی عادات پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ کبھی کسی گاؤں میں نہیں رہا تھا۔ ان کے ہاں آکر اس نے ایک بار بھی اپنی شہری خوبوند کھائی تھی۔ بلکہ مرنہ کو تو ایسا لگتا جیسے وہ اپنے تئیں کسی وندر لینڈ میں آگیا ہے جس کا کونا کونا چھان مارنے کو وہ بے تاب نظر آتا تھا۔ ہمیشہ سے اس گاؤں میں رہتے ہوئے۔ مرنہ نے وہ کام نہیں کیے تھے جنہیں کرنے پر وہ ہر دم تیار رہتا تھا۔ تھوڑے سے دنوں میں اس نے یہاں کئی دوست بنا لیے تھے جن میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ وہ غلیل چلانا سیکھ رہا تھا اور کیرٹی کاڑا کھیلنا بھی۔ کسی دن وہ چوہداریوں کے ٹیوب ویل پر پہنچا غسل فرما رہا ہوتا اور کسی بل جامن کے درخت پر چڑھا پکی کی جامنوں کا ڈھیر اکٹھا کر رہا ہوتا۔ گاؤں کی گلیوں میں اکثر سالی دینے والی آواز۔

”بالو کڑیو! ونڈی دی کھیر لے جاؤ۔“ (بچو اور لڑکیو) تقسیم کی جانے والی کھیر لے جاؤ۔

کی آواز پر وہ زقہ بھرنا گھر سے باہر نکلتا اور واپسی پر چاول کی کھیر یا فرنی سے جی مٹی کی ٹھوٹھیاں اٹھاتا۔ ”تم تو پاگل ہو، بھلا اس میں کیا بات ہے۔ بچوں کے



دعاگوں سے باندھتی تھی نئی شکل دیتی تھی مشوروں پر توبہ توبہ کرتی جاتی۔

”مرو جات توں تیں اللہ سوہنے نے بو تا اچا ہتھ عنیت فرمایا اے اللہ سوہنے دیاں کھیدیاں تیں کوئی لڑائی تائیں تالی بی صیب عقیلاں وی رنج کے عنیت فرمایاں او س دی جات توں اتے زانی توں تیں حکم ای ایہو دیا پئی فرما برواری کرو۔ تالی بی صیب بندہ رنج کے گناہ گار ہونہ اکہ تائیں شکیت تے فریاد کر کے۔“

(مرو کی ذات کو خدا تعالیٰ نے اونچا ہاتھ عنایت فرمایا ہے اللہ سوہنے کے کاموں سے کوئی لڑائی نہیں کوئی قرار نہیں بی بی صاحب! مرو کو اللہ تعالیٰ نے عقل بھی زیادہ عنایت فرمائی ہے اور عورت کو حکم دیا کہ فرمانبرواری کرو بی بی صاحب انسان اللہ سے شکوہ کر کے زیادہ گناہ گار ہوتا ہے کہ نہیں۔“

وہ ایساں سے اپنی بات کے بارے میں رائے لیٹانہ بھولتی تھی۔ اس نے بچپن سے بنتو اوڈھنی کے ایسے ہی فرمان سنے تھے جس کے فلسفے کالب لباب یہ تھا کہ صابر، شاکر، عبادت گزار، خدا کی زمین پر رہنے والے نیک لوگ بہت ہیں، مگر صبر، شکر، عبادت گزار اور نیکی سے بڑھ کر زیادہ اہم چیز راضی برضا ہو جانا ہے۔

”صبر، شکر بھی تو یہ ہی ہوتا ہے راضی برضا۔“ ایک روز جن دنوں وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اس نے یہ اوڈھ ریفٹل باتیں سننے کے بعد پہلی مرتبہ بنتو سے سوال کیا۔

”لوئے میرا بچہ۔“ اس وقت جبکہ بنتو کے بدن میں کمزوری اور بالوں میں سفیدی آرہی تھی اس کی بات سن کر وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد ہنسی۔

”صبر تیں بندہ کروا اے۔ چل رب سوہنیا ہن تائیں تیں فہر کہہ سٹی، شکر دو جاناں اے ایس گل دا کہ جو دتا سو شکر اے او میرے کول آہیں پر او س دی مرضی تیں راضی ہونے دا مطلب رنج ہو رہا تائیں۔“

(صبر تو بندہ اس لیے کرتا ہے کہ اے میرے پیارے رب چل اب نہ سہی، کسی اور وقت تو میری دعا قبول

کرے گا، شکر کا مطلب خدا کے دیے پر شکرانہ ادا کرنا ہے، مگر اس کی مرضی پر راضی ہونے کا مطلب کچھ اور ہے۔)

اس کا کیا مطلب ہے بنتو؟ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”ایس دا مطلب ایہہ آہیں کہ میرا سوہنیا مولا جو تیری مرضی سوہی میری مرضی۔“ (اس کا مطلب ہے کہ میرے سوہنے مولا جو تیری مرضی وہ ہی میری مرضی)

بنتو نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”جو تیری مرضی سوہی میری مرضی۔“

مرید نے بنتو کا فلسفہ بہت کم عمری میں سن لیا تھا مگر وہ اسے بہت دیر تک سمجھ نہ پائی تھی، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب بنتو نے اسے اس کے ابا جی کی وفات پر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”وہی رانی جو رب سوہنے دی مرضی آہیں اوہو ای اوڈھے بندے دی مرضی ہونی چاہیدی۔“ (جو رب سوہنے کی مرضی ہو وہ ہی اس کے بندے کی مرضی ہونا چاہیے)

اس کی سمجھ میں آئی تھی تو صرف یہ بات کہ اس کے ابا جی دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے تھے اور اس کی خالہ اور ان کا اکلوتا بیٹا بھی ان کی وفات پر آیا تھا۔ اسے یہ بھی بات سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کے دونوں چچا ابا جی کی جائیداد میں اپنا حصہ بنور نے اس لیے آگئے تھے کیونکہ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور یہ بھی سمجھ میں آگیا تھا کہ اب ان کا اس گاؤں میں رہنا ممکن نہیں تھا۔

”میں رشید کے بیٹے کو اپنی بچی نہیں دوں گی تبا!“

اس کی اماں نے روتے ہوئے اپنی بہن سے کہا تھا۔

”مگر وہ زبردستی کر رہا ہے صرف چارپے زمین کی خاطر کتا سے لڑکی اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

”لڑکی ہے کوئی جانور یا بے جان شے؟“ خالہ نے

تک کر کہا تھا۔ ”تم بھی۔ ساری عمر سسرال والوں

سے بنا کر نہیں رکھی۔ اب یہ دن بھی اسی لیے دیکھنے



ہے ہیں۔  
 ”اسی لیے نہیں بنی تیرا آپ کو تو پتہ ہے وہ کیسے  
 لوگ ہیں۔“ ماما نے روئے ہوئے کہا۔  
 ”تو کی ادارت نہیں ہے ایسے کوئی ذرہ سی نہیں  
 اٹھا کر لے جاسکتا۔“ خالہ نے تسلی دی۔

ماموں اور ماما بھی حتی المقدور دنا سر دے رہے  
 تھے مگر دونوں چچا کو قابو لال کے پچھلے سارے  
 روئے شہت سے یاد آنے لگے تھے۔ اور وہ دونوں  
 ایک سی بیٹے میں ان سے بدل لینا چاہتے تھے انہوں  
 نے اس کی لال کو اچھی خاصی دھمکیوں بھی دی  
 تھیں۔

وہ یہ سب دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ اس  
 دیکھنے اور سمجھنے کے دوران اسے بھول گیا تھا کہ بنتو نے  
 اسے کون سا فلسفہ سنایا تھا۔

کہانی روایتی سی تھی۔ اس کے اچھے مناظر بھی  
 روایتی ہی رہے۔ لال نے انوں کے اندر اس کا رشتہ  
 اکلوتی خالہ کے اکلوتے بیٹے سے طے کر دیا۔ اور صحت  
 پٹ اس کا نکاح پر مہا کر اسے خالہ کے ساتھ رخصت  
 کر دیا۔ اسے یہ ساری باتیں سارے منظر یاد رہے  
 گئے مگر انہوں نے ہونے کا رنج اور گدہ اتنا زیادہ اس کے  
 دل میں تھا کہ اسے بنتو کا فلسفہ بالکل ہی بھول گیا۔

خالہ کا اکلوتا بیٹا سلمان خالہ جو جناتی صفات کا حامل  
 نظر آتا تھا۔ اتنے سادوں میں بہت بدل گیا تھا۔ وہ  
 سو فٹ ویر انجینئرنگ کے تیسرے سال کا طالب علم تھا  
 اور اس کا رنگ و صفت ہرگز وہ نہیں رہا تھا۔ جو بہت  
 مایہ پہلے مرینہ نے اس کی اپنے گاؤں میں پہلی آمد کے  
 موقع پر دیکھا تھا۔ غلیل چلا تا سیکھنے والا اور خستوں پر چڑھ  
 کر بکی ہوئی جامنی چٹنے والا، بھٹی ہوئی مٹی اور چاولوں  
 سے جھولی بھر کر لانے والا اور کھیر کی ٹھونٹھیاں چائے  
 والا ایک خوش شکل، خوش لباس، جدید قطع وضع کے  
 جاس نو جوان میں بدل چکا تھا۔ وہ دیکھنے میں ہی ایک  
 نفیس اور شائستہ لڑکا نظر آتا تھا اور اس کی حقیقت  
 پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ انفرادی میں اپنے لیے بندھ  
 جانے والی اپنی ایک دور افتادہ گاؤں میں رہنے والی خالہ

کی اس بھڑکی سی کم عمر اور کم فہم لڑکی کو زندگی کی  
 سانس کی طور پر یوں قبول کر دیا تھا کہ اس کی مائ کا  
 حکم تھا۔ اس کا اپنا گیریزا بھی بنا نہیں تھا اور وہ ایک  
 انسانی ذمہ داری کا چارج سنبھال رہا تھا۔ مگر اس انسانی  
 ذمہ داری کو گھر کی آسودہ حالی نے محسوس نہیں ہونے  
 دیا تھا۔

”تمہارے ساتھ جو ہوا اس پر جتنا بھی افسوس کیا  
 جائے کم ہے۔“

اس نے پہلی رات مرینہ کو مخاطب کرتے ہوئے  
 نرمی سے کہا تھا۔

”مگر میرا خیال ہے کہ ماضی کو بھول جانا اور حال میں  
 چھنے کی کوشش کرنا ہی دانش مندی ہے۔ تم کیسے بھی  
 سنی، میری زندگی میں آئیں بہر حال میری قسمت  
 میں تمہارا ہی ساتھ لکھا تھا جب ہی جو چند دن پہلے سوچا  
 نہ بھی تھا وہ آتا، فنا، ہو گیا۔ میرا تمہیں مشورہ یہ ہی  
 ہو گا کہ پیچھے کو بھول جاؤ۔ آگے کی سوچو۔ تم نے ابھی  
 صرف میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ اس سے آگے بہت  
 سے ایسے گولڑے ہیں جن میں سے کسی ایک کو اگر تم  
 مقصد حیات بنا لو تو تمہاری زندگی آسان اور با مقصد  
 ہو جائے گی۔“

مرینہ کا ذہن اور سمے کی ناگمانیوں نے پہلے ہی  
 تقریباً ”ہوٹ کر رکھا تھا اس پر ایسی بھاری بھر کمند سمجھ  
 میں آئے والی باتیں گولڑے مقصد، مقصد حیات، با مقصد  
 اس کے لیے کچھ بھی نہیں پڑا۔ وہ بس جو اس بابت سی  
 ہنر ہنر کر کے اسے دیکھتی رہی جو واقعی بہت بدل گیا  
 تھا۔

مرینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سلمان نے پہلی  
 رات اس سے کیا کہا تھا۔ مگر سلمان کو خوب اچھی  
 طرح یاد تھا کہ اس نے پہلی رات کیا بات کی تھی وہ  
 ایک پریکٹیکل انسان تھا۔

”سیدھی سی بات ہے جی۔“ اس کی خالہ نے لگی  
 لپٹی کے بغیر کہا تھا۔ ”مرینہ کو چچا لال کے بیٹوں سے  
 بچانے کے لیے میں نے سلمان کو شادی پر مجبور کیا، میرا  
 بیٹا اتنا فرماں بردار تھا تو ہی اس نے میرے کہنے پر اپنی



سوچ اور خوابوں کی قربانی دی۔ مرینہ کی عمر ابھی کچی ہے یہ چاہے تو اس کی پسند میں ڈھل سکتی ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔ ویسا کرتی جائے۔“

اس کی اماں نے ان خیالات کی تائید فرمائی۔ اور مرینہ کو اپنی خیالی دنیا کو تیاگ دینا پڑا۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں مگن اپنے تئیں کیا کیا ہمتی تھی بھول جانا پڑا۔ گھٹکھو گھوڑوں اور سرکنڈوں سے بنے بھس بھرے رنگ برنگے کھلونوں کی دنیا سے باہر نکل کر زندگی کے دھندلوں میں گم ہو جانا پڑا۔

وقت سرعت سے گزر رہا گیا۔ وہ سلمان کی پسند میں ڈھلنے اور خود سے شادی کر لینے والے اس کے احسان کو اتارنے کے چکر میں اندازہ ہی نہ لگا سکی کہ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا۔ ایف اے گریجویشن اور پھر ایم بی اے فنانس وہ کتابوں اور کالجوں، یونیورسٹیوں کی دنیا میں کھب گئی۔

ایک دہائی سے شہری لڑکی میں ٹرانسفارم ہونے کے سفر میں اس کی اصل شخصیت مصلحتوں کے دھبہ پردوں میں دبتی چلی گئی۔

سلمان اور خالہ مل کر اس کی شخصیت کی گرد و منگ کر رہے تھے۔ کھڑے کیسے ہوتے ہیں۔ بیٹھتے کیسے ہیں، چلتے کیسے ہیں، بات کیسے کرتے ہیں، عجب کیسا ہونا چاہیے، میز پر بیٹھ کر کھانا کیسے کھاتے ہیں، چھری کاٹنا کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اچھے کپڑے پہنے کا ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ اچھے لوگوں سے ملنے کا انداز کیسا ہوتا ہے۔ سلمان کا معیار بلند تھا اور وہ اس معیار کو چھونے کے چکر میں اپنا قد اونچا، اونچا اور اونچا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی رہی۔



”نو آر ریٹلی ڈفرنٹ۔“ اس ایگزیکٹو ڈنر کے دوران اس کی ٹیبل پر بیٹھے رشید پر اچھے نے کالے زیتون کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

”خواتین کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں“ اس نے مزید خیال آرائی کرتے ہوئے کہا۔ ”سادہ“ بے نیاز“

بہت غیر معمولی مگر اپنی حقیقت سے بے خبر، بہت معمولی مگر خود کو کیش کرانے کے فن سے واقف، بہت غیر معمولی اور خود کو محسوس کرانے کے تمام گر جانے والی، تمہارا تعلق آخری قسم سے ہے۔“

”بہت غیر معمولی اور خود کو محسوس کرانے کے تمام گر جانے والی۔“ اس نے اورنج جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے دل میں تمام قسموں کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا اور اس کا دل زور سے کروٹ بدل گیا۔

”تمہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ خود کو کہاں اور کیسے محسوس کرانا ہے۔ کس موقع پر صرف لکس سے، کس موقع پر لکس اور لباس دونوں سے۔ کس موقع پر گفتگو سے اور کس موقع پر اوپر والی پورشن کے گرد کھانے سے۔“ پراچہ نے ہنسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور جس خاتون کو خود آگاہی اتنی دافر مقدار میں عطا کر دی گئی ہو، اس کی کامیابی کے راستے میں کوئی بیریز نہیں ہوتے۔ اس کا راستہ سیدھا اور شفاف ہوتا ہے، مختصر بھی ہو جاتا ہے اور بہت جلد وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچ کر نیچے کھڑی مخلوق کے نعروں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دے رہی ہوتی ہے۔“

”آپ مبالغے سے کام لے رہے ہیں پراچہ صاحب!“ اس نے اپنے بلیوں اچھلتے دل کو قابو کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”بس یہ بھی تو تمہاری جیسی خواتین کی ایک خاص خوبی ہوتی ہے۔ جہاں موقع ہو، ضرورت پڑے، بے نیاز ہو گئیں۔ اپنے زور بکتر میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ اور ان کی یہ ادا تمہیں معلوم ہے کہ ان کی قدر و قیمت برصا دیتی ہے۔ اس ادھر مردوں کی صنف زیادہ جان دیتی ہے۔“ پراچہ نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو، ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے اپنے دل میں بھرپور تائید کرتے ہوئے اپنی پلیٹ میں موجود چاولوں سے اورنج پیس نکال کر کھاتے ہوئے سوچا، اور چہرے پر ایک مخصوص سا تاثر اوڑھ کر بولی۔



”مجھے معلوم نہیں، میری معلومات ناقص ہیں۔  
ہوتا ہو گا ایسا ہی ممکن میں ایسا دانت نہیں کرتی اگر کسی  
کو میری شخصیت میں ایسی کوئی جھلک نظر آتی ہے تو  
یقین جانیے کہ یہ قدرتی ہے، میں شخصیت کے مختلف  
رنگ نمایاں کرنے کے معاملے سے بالکل نااہل  
ہوں۔“

”اور یہ ایک اور ادا ہے۔“ پراچہ نے قہقہہ لگایا۔  
”اور سب سے خوبصورت ادا ہے۔“ کچھ خواتین اتنی  
کمپوز ہوتی ہیں کہ اندرونی جذبات کا ایک ہلکا سا بھی  
عکس ان کے چہرے پر ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہیں  
دیتا۔ سول دن مرینہ سلمان! میں پشین گوئی کرتا ہوں کہ  
تم آگے جاؤ گی بہت آگے، کامیابی کی چوٹی پر بیٹھے  
کھڑے ہم جیسے لوگوں کو ویو کرنے کے لیے۔“



”یہ اچھا ہے بہت اچھا۔“

سلمان نے فاضل سمسٹر میں اس کی کامیابی پر اسے  
نئے نئے ہیروں سے مرتیں ایک چھوٹا سا لاکٹ تھے میں دیا  
تھا۔ ان کی شادی کو نو سال گزر چکے تھے۔ حالات نے  
وقت کی سرعت کے ساتھ تیزی سے شکل بدلی تھی۔  
سلمان کو ایک اچھی پراسیوٹ کمپنی میں جاب مل گئی  
تھی۔ اس کی تنخواہ پر کشش تھی اور گھر، گاڑی فون  
جیسی مراعات بھی حاصل تھیں۔ وہ پنڈی سے لاہور  
شغف ہو چکے تھے۔ مرینہ کی اماں جنہیں وہ گاؤں میں  
تہنا چھوڑ آئی تھی۔ اس کے بچپاؤں سے مختلف  
مقدمات میں کئی سال ابھی رہنے کے بعد ایک دن  
عدالتی جنگ کا فیصلہ ہونے سے قبل ہی زندگی کی جنگ  
بارگئی تھیں۔

وہ سب کچھ جسے بچانے کے لیے انہوں نے مرینہ  
کی زندگی کو ایک نئے راستے پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔  
اور انجنتوں کے نئے باب اپنے لیے کھول لیے تھے۔  
بڑی آسانی سے بچپاؤں کے قبضے میں چلا گیا۔ مصلحت  
اندیش خالہ نے بیٹے کو کسی بھی پھندے بازی کی  
اجازت نہیں دی تھی اور یوں اس کا اس گاؤں سے

واجبی سا تعلق بھی ختم ہو گیا تھا۔ مرینہ ان میں سے ایک تھیں  
لاہور شغف ہونے سے پہلے دیا چھوڑ گئے اور اب خالہ  
کا دم نصیحت تھا جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔  
”تمہارا لکچر لکھٹ ہے۔“ سلمان نے ہیرے  
کے لاکٹ کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نن  
بچپائی کی پیدائش نے بھی تم پر کچھ اثر نہیں چھوڑا“ مجھے  
ایسا لگتا ہے کہ تم دن بدن زیادہ نکھر رہی جا رہی ہو۔ میں  
خود کو خوش قسمت سمجھوں یا نہ سمجھوں۔“  
”تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“  
مرینہ نے اس کی طرف سے رخ موڑتے ہوئے کہا۔  
”ستائش کا یہ انداز مجھے کچھ زیادہ نہیں بھاتا۔ فکرو کی  
تعریف کا کوئی فائدہ نہیں اس کو تو وحل ہی جانا ہے۔  
شغل و صورت بھی وقت کے ساتھ پہلے جیسی نہیں  
رہتی۔ کچھ اور نہیں ہے جس کی تعریف کی جا سکتی  
ہو۔“

وہ بے اختیار ہنس دیا۔ ”تمہیں معلوم ہے میرے  
یہ الفاظ بتاوتی ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ عورت اسی قسم کی  
باتوں سے خوش ہوتی ہے۔ خوبصورتی کی تعریف اس  
کے لیے گولڈ میڈل کا سادہ جبر کھتی ہے۔ ورنہ تم خوب  
جانتی ہو کہ وہی چیز جس کی تعریف کی جانی چاہیے  
میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ تمہاری  
سکریٹنسنگ اسپرٹ (قربانی کا جذبہ) تمہارا عزم،  
حوصلہ اور جدوجہد جس کا سرا تمہاری ذہانت اور  
قابلیت کو جاتا ہے۔“

ان گزرتے سالوں میں نبھانے کیوں پہلی مرتبہ  
مرینہ کو سلمان کی باتوں سے کوفت اور ابھرن سی  
محسوس ہوئی۔

”ذہانت، قابلیت، قربانی، عزم، حوصلہ۔“ اس کی  
روح پچھڑ پچھڑائی۔ ”کسی کی ذات پر آپ کو مکمل اختیار  
حاصل ہو جائے اور آپ اس کو اپنی پسندیدہ سان پر  
ایک عرصہ رکھتے رہیں تو وہ ویسی ہی شغل اختیار کر  
جائے گی جس کا نقشہ آپ کے ذہن نے تیار کر رکھا  
تھا۔“ اس نے لاکٹ جھکے سے اتارتے ہوئے  
جھنجھارے ہوئے انداز میں سوچا۔



”میری کسی بھی قابلیت کو سرے باندھنے کا شوق نہیں۔“ اس نے جھنجھلا جانے کے باوجود نرمی سے کہا۔ ”مجھے جاب مل رہی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جاب کرنے سے کوئی فرق مجھے تو ہرگز نہیں پڑے گا، لیکن امی نہیں مانیں گی۔ اب انہیں ایک گھر ہسٹن، سودیکھنے کی آرزو ہے۔“

”ہیل دو۔“ گاؤی، ہونق، اپنی دنیا میں مگن رہنے والی سے ایک پڑھی لکھی ویل گروڈ لڑکی میں بدل جانے والی لڑکی دل میں چلائی۔

”گھر ہسٹن ہو، ہونہ! اس نے ناک سکوڑی۔

”اتنے سال مجھے دو دھاری تلواریں چلاتے رہے یہ لوگ، بڑھو لکھو بھی، گھر گھر ہستی بچی سیکھو۔ خالہ کو خوب معلوم تھا کہ مجھے ایذا تلنا بھی نہیں آتا۔ انہوں نے میرے والا گھونٹ پھر بھی بھرا۔ کڑوا، میٹھا مجھے معلوم نہیں انہیں کیسا لگا، لیکن جب بی لیا تو تھو تھو یا ہپ ہپ کرتے دس بار سوچنا چاہیے تھا انہیں۔ مگر انہوں نے اتنے سالوں میں دونوں ہی کام کیے۔ پڑھایا بھی اور گھر ہستی بھی سکھائی۔ وہ نمبروں، اعداد و شمار اور بریانی سالوں، کوفتہ پلاؤ، بیل وار پر انہوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش میں سرپٹ بھاگتی رہی تھی۔ مگر اب وہ وقت تھا جس میں وہ کچھ فیصلہ خود بھی کرنے کا حوصلہ اپنے آپ میں محسوس کر رہی تھی۔ ٹھیک تھا اس نے احسان مندی کے جذبے کے تحت بہت کچھ کیا تھا ان لوگوں کے لیے مگر اب اپنی زندگی گزارنے کا وقت آچکا تھا اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

”ضروری تو نہیں کہ بڑھ لکھ کر نوکری کی جائے“  
رہنا لکھنا شخصیت کے نگہار اور اس کی خوبصورتی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ نوکری تو مجبوری کا سودا ہونی چاہیے۔“ ان گزرتے سالوں میں پہلا اختلاف سلمان کی بات نے ان دونوں میں پیدا کیا۔

”ذریعہ معاش کا حصول مردوں کی مردانگی قائم رکھنے کا ذریعہ ہے تو عورتوں کی نسائیت کس ڈھنگ

سے اجاگر ہونی چاہیے۔“ مرینہ نے مڑ کر ریونم کی بوتل کا ڈھکن لگاتے ہوئے کہا اور ایک نظر اٹھا کر سامنے آئینے میں نظر آتے سلمان کے عکس کو دیکھا۔ ایک آسودہ حال گھر بسانے میں، ایک نسل کی تربیت میں، ایک پرسکون ماحول کی تخلیق میں۔ آئینے میں سلمان کے نہیں ایک ماچوین کے ہونٹ ہلکتے دکھائی دیے۔

”تو پھر اس ساری ریاضت اور تک و دو کی کیا ضرورت تھی بانی داوے؟“ مرینہ نے بے اختیار مڑ کر اس کی آنکھوں میں براہ راست آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”کیا میری ماں، اور تمہاری ماں اس خاندان کی ساری مائیں۔ فنانس میں ایم بی اے کرنے کے بعد گھر بسانے بیٹھی تھیں؟ کیا ایک آسودہ حال گھرانے کی عورت کے دوٹپے کی کٹی میں ایک بڑی ڈگری کا بندھا ہونا بھی شرط ہے کیا پہلے اس خاندان میں آسودہ حال گھر نہیں بے غنسلوں کی تربیت نہیں کی گئی؟ پرسکون ماحول تخلیق نہیں ہوئے؟“

وہ چلا کر بولی تھی اور اس نے ہاتھ میں پکڑی ریونم کی شیشی کو بھی گھما کر سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔ کمرے میں کرسیاں بکھر گئی تھیں اور شہنل کی خوشبو ہر سو پھیل گئی تھی۔



”اس کی ماں بھی ایسی ہی اتھری تھی۔“ یہ اس کی خالہ اور ساس کا فرمان تھا۔ ”اس نے تو صرف میٹرک کی ٹی بی سی کیا تھا پھر بھی اتر اہٹ اور غرور کا کوئی عالم نہ تھا“ آخر میں انجام دیکھا اس کی خود سری کا۔

وہ کسی ناویدہ واقف حال سے سوال کرتے ہوئے بولیں۔

”اس کا تو میاں بھی تھا زین مرید، سب بہن بھائیوں، ماں، باپ کو چھوڑ چھاڑ اس کی گود میں چھپ کر بیٹھا رہا ساری عمر، اب تم سوچو، تمہاری کیا صلاح ہے؟“ اب کے ان کا مخاطب سامنے صوفے پر بیٹھا ان کا بیٹا تھا جو چہرے کے آگے صبح کا تازہ اخبار پھیلا کر اس میں مگن



تھا۔

”آپ وہم نہ کریں امی اُدھ کوئی دودھ پیتی پکی نہیں ہے۔ اتنے سال اس نے ہماری آپ کی سب کی مالی ہے۔“ اس نے ان کے دوبارہ اپنا سوال دہرانے پر بالکل ناخواستہ اختیار سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کی ذہانت سے میں بھی واقف ہوں اور آپ بھی اب اگر اسے شوق آیا ہے تو کوری کرنے کا اور آفر بھی اچھی ہے تو کر لینے دیں کچھ عرصہ یہ تجربہ بھی۔ مجھے یقین ہے۔ جلد ہی تھک کر بیٹھ جائے گی گھر۔“

”یہ ہی تو زن مریدی کی پہلی نشانی ہے۔“ امی نے اس کے لہجے میں چھپی پسائی کو بھانپ کر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”بچوں کا خیال نہیں ہے تمہیں اور اسے چار سال کا تمہارا بیٹا اور دو سال کی بیٹی میں نے راتیں اور دوپہر س جاگ جاگ کر پالے۔ اس خیال سے کہ چلو کوئی بات نہیں تھوڑے دنوں کا چکر ہے پھر ماں فارغ ہو جائے گی تو اسی نے سنبھالنا ہے نا ان کو میری تو سمجھ میں نہیں آتا مانی! مٹی تم نے بھگوئی، گوندھی تم نے، اسے شکل نم نے دی چکر پر گھما گھما کر پھر وہ چیز کیوں نہیں بنی جو ہم بنانا چاہتے تھے۔“

”یہ کوئی ریت مٹی کی بے جان شے نہیں ہے ماں جی اس کے اندر روح بھی ہے دل بھی ہے دماغ بھی اور عقل بھی، احساسات بھی ہیں اور خواہشات بھی۔ ان سب چیزوں پر آپ ہم کیا پابندی لگائیں گے۔ رہی بچوں کی بات تو ان کی ماں کی اصل تربیت بھی تو آپ ہی نے کی تھی نا میں تو جی بھر کر چاہوں گا کہ میرے بچوں کی تربیت بھی آپ کے ہاتھوں ہی ہو۔“

سلمان نے کہنے کو تو معاملے کو بخوبی سلجھانے کے لیے خود بھی پسائی اختیار کر لی اور اپنی ماں کو بھی باتوں میں لگا کر وقتی طور پر خاموشی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ مگر مرینہ کا معاملہ الٹا جا رہا تھا۔ وہ بہت سالوں بعد آہستہ آہستہ خود آگاہی کی طرف برہم رہی تھی۔ اسے اپنے متعلق نت نئے گمانوں نے اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ ایک بڑے بینک میں اچھی سیٹ پر پرکشش سلیری کے ساتھ جاب جوائن کرنے کے ساتھ ہی خود

سے متعلق احساس کمتری سے بھرپور اس کے کئی تصورات ختم ہونے لگے۔ اس کے ارد گرد لوگوں نے اسے اس کے متعلق نئی نئی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ وہ خویاں جن کے متعلق وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس میں موجود ہیں۔ وہ ٹیلنٹ، جو چھپا ہوا تھا وہ اعتماد جسے زبردستی دیا کر رکھا گیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ جاننے لگی کہ زندگی کا اصل رنگ کیا ہونا چاہیے۔ لباس ایک ایسی چیز تھی جس کے بارے میں اسے پتا چلا یہ صرف تن ڈھانپنے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتا، یہ شخصیت کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ ٹرینڈز، ایک ایسا لفظ تھا جس کی تقلید ایک عام سے انسان کو بہت خاص بنا سکتی تھی۔ گنٹلو کا فن عام سی بات کو بھی کیسے خوبصورت بنا سکتا ہے اور اسٹائل وہ ہتھیار ہے جو شخصیت کو ہر دل عزیز اور ممتاز بنانے میں انتہائی معاون ثابت ہوتا ہے۔

جوں جوں وہ آگاہی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو اس کا دل سلمان اور خالہ سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے لگتا ان لوگوں نے اس کے ساتھ اتنے سال بری طرح ڈنڈی ماری تھی۔ سارے گر سکھا دیے صرف درخت پر چڑھنے کا ہنر نہیں سکھایا، وہ بھی جان بوجھ کر، وہ اسے اپنی مرضی کی سان پر ہی رگڑتے رہے۔ اسے اپنی زندگی کے ایک حصے کے زیاں کا دل سے دکھ ہوتا۔



اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے اپنا چہرہ مضحک اُترا ہوا اور پریشان نظر آیا۔

”میں بے وجہ وہم کا شکار ہو رہا ہوں یا پھر جو میں سوچ رہا ہوں وہ سچ ہے؟“ وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ کئی دن سے انہی ڈھارس بندھا رہا تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ وہ خود کو جو یقین دلا رہا تھا وہ محض فریب تھا اور جس گھر کو بنانے میں اسے کئی سال لگے تھے اس گھر کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے تک اسے مرینہ پر افسوس ہوتا تھا جو اپنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود وہ بن نہیں پارہی تھی



جو اسے بننا چاہیے تھا۔ مگر اب اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس کی اتنی اسے برتن اور پانی کی مثالیں دیتے نہیں تھکتی تھیں۔ اسے والیوم اور کھپسٹی کے باب یاد آتے تھے جن میں واضح لکھا ہوا تھا کہ کوئی برتن بھی اپنی گنجائش سے زیادہ محلول نہیں رکھ سکتا۔

مگر وہ مرینہ کو برتن نہیں سمجھتا تھا۔ اسے کسی بھی بے جان شے سے تشبیہ نہیں دیتا تھا۔ وہ اسے گوشت پوست کی زندہ اور محسوس انسان سمجھ کر اس سے ویسا ہی برتاؤ کرتا تھا جیسے اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس کی زندگی میں کسی ناخواندہ مہمان کی طرح تلی تھی مگر اس نے اسے دل سے خوش آمدید کہا تھا۔

اس کے کچھ آئیڈیلز تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ان سب کی خصوصیات ایک انسان میں اسے مجسم نہیں مل سکتی تھیں سو اس نے مرینہ کو خام مال کی طرح ہاتھ میں لے کر اپنے تمام آئیڈیلز کی خصوصیات اس میں جمع کرنے کی کوشش کی تھی اور گزرتے سالوں کے رات دن اس پر محنت کرتے گزارے تھے۔

مرینہ تو وہ بن گئی تھی جیسی وہ چاہتا تھا مگر وہ خود کہیں بہت پیچھے بہت نیچے رہ گیا تھا وہ ایک ماورائی مخلوق میں ڈھل گئی تھی اور سلمان خالد اس کا معیار نہیں رہا تھا۔ یا پھر جیسی زندگی وہ اب گزارنا چاہتی تھی وہ سلمان خالد کے ذہن سے میل نہیں کھاتی تھی۔ جو بھی تھا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ بہت غلط۔ اور اس غلط کو صحیح کرنے کا سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔



”گنی پگ“ اس نے نیشنل جیو گرافک پر ایک دستاویزی فلم دیکھتے ہوئے دل میں دہرایا۔ ”مسلمان اور خالہ نے مجھے بھی گنی پگ کی طرح پالا۔ جو دل چاہا۔ مجھ پر تجربہ کر لیا۔ اور یہ بہت غلط کیا۔“

اس کے دل کی بے چینی بڑھ گئی اور اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ وہ لی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ قیمتی فریچر اور سلمان آرائش سے سجا کرہ۔ اس کے ایک سائیڈ پر ڈائمنگ نیبل رکھی تھی جس کے ساتھ

ہی بچن تھا۔ جدید بچن کام کرنے کی ہر سہولت سے مزین۔ یہ سارا سلمان بچن کی تمام کراکری ہجوم اسٹریز سب اس کی مرضی اور پسند سے خریدی گئی تھیں۔ مگر اس کی مرضی کہاں تھی۔ اسے ایک دم ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی اب تک کی جتنی زندگی تھی سب کی سب اس کی مرضی کے خلاف گزری تھی۔

وہ سب کام بھی جو بظاہر اس نے اپنی مرضی سے کیے تھے۔ دراصل لاشعوری طور پر دوسروں کو خوش رکھنے کی کوششیں تھیں۔ اس کے ذہن پر منفی سوچوں کا نزول ہوا تو کچھ عرصہ پہلے جس بنے بنائے گھر کی ملکیت کا اسے دعوا تھا۔ اس کی ملکیت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اسے بھولنے لگا کہ اس گھر کے مہینوں نے اسے وقت کے کس نازک موڑ پر ایسا سہارا فراہم کیا تھا جس کا نہ ہونا اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں گم کر دیتا۔ اسے بھولنے لگا کہ اس گھر میں وہ صرف کسی کی بہو اور کسی کی بیوی ہی نہیں تھی۔ اس گھر میں اس کی ایک حیثیت اور ہی تھی۔ وہ حیثیت ایک ماں کی تھی۔ وہ دیتے جن کے بارے میں پہلے وہ بات کرتے ہوئے ہنسی تھی اور کہتی تھی۔

”صرف انہیں پیدا کرنے کا جرم مجھ سے سرزد ہوا“ دراصل تو یہ خالہ کے بچے ہیں۔ انہیں جن کے حوالے کر کے میں دوبارہ کاجوں، یونیورسٹیوں کی دنیا میں گم ہو جاتی تھی۔

جب اس نے فاسٹل سسٹر کلینر کیا اس وقت اس کا بیٹا چھ سال کا اور بیٹی چار سال کی تھی اور دونوں ہی اسکول جاتے تھے۔

”لو بیٹا! اب یہ تمہاری لمانتیں تمہارے حوالے“ سب کچھ تو اب تک میں نے دیا مگر ممتا کی جو ممتا اپنی ماں دے سکتی ہے۔ وہ میں نہیں دے سکی اور اسی سے یہ بچے محروم ہیں۔“

خالہ نے دونوں بچے اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا تھا اور اس وقت اس نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اب وہ اپنی ممتا کو بریکنگ ماڈ میں تبدیل کر دے گی۔ مگر شاید اس کا وقت آنا ہی نہیں تھا۔ شاید یہ سعادت خالہ ہی



کے حصے میں لکھی گئی تھی۔ شاید ان بچوں کے ذہنوں میں ماں کا صرف ایک تصور، ایک ہیولہ ہی باقی رہ جاتا مقدر تھا۔ اسی لیے جب وہ وقت آیا جس کا خالہ اور سلمان کو انتظار تھا یعنی گھر گرہستی چلانے والی ایک تعلیم یافتہ، منظم عورت کا گھر میں وجود جو کسی نعمت غیر متروکہ سے کم نہیں ہوتی۔ اسی وقت مرینہ سلمان پر بہت سی حقیقتیں آشکارا ہونے لگیں اور آگاہی کے نئے دورا ہونے لگے۔



”میری مصروفیات، میرے مشغلے، میرے اوقات کار اور میری سوچیں سلمان کے اعصاب پر سوار ہونے لگیں۔“

اس نے متورم آنکھیں سامنے دیوار پر لگے منقش فریم میں جڑے آئینے میں دیکھتے ہوئے آئینے میں نظر آئی اپنی شبیہ کو مخاطب کیا۔

”جواب ایسی تھی جس میں سخت محنت درکار تھی۔ اور بے شمار وقت پاؤں جمانے کے لیے۔ اس کا تقاضا ایک جدید عورت تھی، خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار رفتہ رفتہ یہ سارے گرجھے سیکھنے پڑے اور مجھے آتے بھی گئے۔ ذہن تو میں ہمیشہ سے ہی تھی نا! اس نے ایک طنز بھری مسکراہٹ اپنی شبیہ کی طرف اچھالتے ہوئے سوچا۔

”پھر یوں ہوا۔“ وہ جیسے کسی کو کوئی کہانی سنارہی تھی۔ ”کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ہماری سوچیں، ہمارے مسائل، ہماری خوشیاں، ہمارے مزاج سب کچھ میں آگے۔ آگے بہت آگے جانے کی خواہش دل سے نہیں نکال سکی اور میری اس سوچ کے ہر پہلو کی آواز پر سلمان ”نہیں، نہیں، ہرگز نہیں“ چلانے سے خود کو روک نہیں سکا۔ بڑی روایتی سی کہانی ہے۔“ وہ ایک بار پھر طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ خود کو دیکھ رہی تھی۔

”گنتا طویل عرصہ تھا زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھنے کا، ایک طرف پر بھائی دوسری طرف گھرداری۔“

کھلونے کھیلنے کا زمانہ تو بہت پیچھے کہیں۔ بہت ہی پیچھے رہ گیا تھا۔ زندگی کے گھگھو گھوڑے میرے ارد گرد ناچنے لگے تھے اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کا طریقہ سکھانے کے لیے کسی بلیو اوڈھنی نے آگے بڑھ کر میری مدد نہیں کی۔ میں سلمان اور خالہ کا معیار بننے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور ان کا معیار بنتے بنتے میں سلمان اور خالہ دونوں کو ہی بہت پیچھے چھوڑ گئی۔

”میں خواہشات کے انقلاب کا شکار ہو گئی مرینہ سلمان جسے صحیح معنوں میں مسز مرینہ سلمان بننے کا شرف حاصل ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہی گزر رہا تھا اس دہانہ پر باور کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ ایک بلند شخصیت کی مالک ہے۔ تجربہ گاہ میں بنے گئی پگ، کو موٹو اسٹائش لیڈی کا خطاب دیا جانے لگا۔ اس کے انداز و اطوار کو معیار قرار دیا جانے لگا۔ اسے تعریف سننے کی عادت سی ہونے لگی اور اس جال میں پھنس کر وہ مدہوش ہوتی چلی گئی۔

”دو بچوں کی ماں تو بہت دور کی بات ہے، تم تو میرے سے شادی شدہ ہی نہیں لگتی ہو۔“ کسی نے اس سے کہا اور یہ درست بھی تھا۔

”ارے! تم نے اتنی آسانی سے اپنا آپ دو سروں کی مرضی کے حوالے کر دیا۔“ یہ تبصرہ شازیہ نے کیا تھا جو پروفیشنل لائن میں اس کی قریب ترین کولیگ تھی۔ ”کسی کو کیا حق پہنچتا تھا تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈیز کو اس طرح ایکسپلائٹ کرنے کا۔“ اس نے اس کی پوری کہانی سننے کے بعد کہا تھا۔

”میری اماں نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے ان کے حوالے کیا تھا۔“ اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

”تو کیا ہوا؟“ وہ خفگی سے بولی ”میں کیا حق پہنچتا تھا تم سے قربانی اور ایثار کی تاریخیں رقم کروانے کا۔ اور تم اب ہی دیکھ لو، تم ایک ایسے راستے پر کھڑی ہو، جہاں سے آگے کا سارا منظر روشن اور شاندار ہے اور تم کہتی ہو کہ تمہارا شوہر اور تمہاری ساس تمہارے جاب کرنے کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم سب



کچھ چھوڑ کر ہانڈی چولہا سنبھال لو، کتنی خود غرض ہے تمہاری ساس، تم پر احسان جتا کر بھی جھنڈے اپنے نام کے گاڑ لیے اور اب تمہاری مثالیں دے کر مظلومیت کی علامت بن کر رہنے کی تیاریوں میں ہیں۔ میں تمہیں الٹ سٹل دے رہی ہوں مرینہ، ان لوگوں کے عزائم سے ہوشیار رہنا۔ یاد رکھنا کہ بچے شوہر گھر گھر داری ایک عام سی چیز ہے جو 90 فیصد خواتین کی دسترس میں ہے۔ ایک شاندار کیریئر، شاندار زندگی جو تمہاری منتظر ہے وہ کسی کسی کو ہی ملتی ہے اسے ہاتھ سے گنوانے کی حماقت مت کرنا۔ عمر بھر بچتا ہوگی۔

ایک طرف یہ دلکش باتیں اور خوش آئند نظارے تھے دوسری طرف گھر میں آئے دن ان کی چیخ و جھج اور ٹینشن۔ خالہ اس سے دو ٹوک بات کرتیں۔

انہوں نے اس پر اتنے سال محنت یوں ہی نہیں کی تھی۔ اتنی مشقت تو سگی ماں بھی نہ کرتی ہوگی۔ اتنا ساتھ دینے کا حوصلہ تو سگی ماں کو بھی نہ ہوتا۔ اس کی زندگی سنوارنے اور عملی زندگی میں اس کو ایک رول ماڈل بنانے کا عمل کتنا مشکل تھا۔ وہ کہاں کہاں تھکیں وہ کہاں کہاں آبلہ پا ہوئیں اب انہیں سب یاد آنے لگا تھا۔ انہیں اپنے بیٹے کی وہ ساری انوسٹ منٹ بھی یاد آتی جو اس نے مرینہ کو ایک مثالی عورت بنانے کے لیے کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پیسہ کما کر اس انوسٹ منٹ کو دگنا کر دے۔ وہ اسے رافٹ ابل ایبل اینٹنٹی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ایک کم عمر، کم پڑھی لکھی لڑکی کو جدید ترین تعلیم دلوا کر اپنے گھر اور اپنی نسلیں کے لیے ایک مضبوط بنیاد اور ایک روشن مستقبل کی ضمانت فراہم کرنا چاہتا تھا۔

انہیں سعدان اور تانیہ کی زندگی کی فکر لاحق رہنے لگی تھی۔ جن بچوں کی ماں کے منہ کیریئر لگ جائے۔ ان کی پرورش اور تربیت کون کرے۔ ان کی زندگی سنوارنے کا ذمہ دار کون ہے؟

وہ ان خیالات کا اظہار اچھے بیٹھے کرتیں۔ سلمان کے کانوں میں بھی اپنے بھاشن ڈالتی رہتیں۔

سلمان اچھے لگا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نہیں چاہا

تھا کہ مرینہ آٹھ سے پانچ بجے تک کی کسی ایسی نوکری میں پھنس جائے جس کی ذمہ داریاں پانچ بجے کے بعد اور بھی سوا ہو جائیں۔ ایگزیکٹو مینٹلز، ایگزیکٹو ڈیڑز، میل ملاقاتیں، پارٹیز، سینارز، وہ دن بدن زیادہ سے زیادہ مصروف ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مرینہ کو اتنا پابند کر دے کہ اس کے سیکھے سکھائے کو ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگے۔

سلمان زور رہے پر کھڑا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سعدان اور تانیہ کو ابھی بھی اس کی مایا ہی سنبھالتی تھیں۔ گھر اور بچن کو بھی وہی دیکھتی تھیں۔ اگرچہ گھر میں کام کرنے کے لیے ملازم موجود تھے مگر ان کی نگرانی کرنا بھی ایک کام تھا۔ اس کی امی نے سلیقہ اور سمجھ داری کے ساتھ عمر گزار دی تھی اور گھر چلایا تھا۔ انہیں اپنے گھر میں یہ ماحول اور طریقہ کیسے پسند آ سکتا تھا۔



”تم ایک بار جب ہمارے گھر آئے تھے تو تم ہمارے گاؤں کی روٹین میں یوں رچ بس گئے تھے جیسے سدا سے وہیں رہتے رہے ہو۔ تمہیں یاد ہے کہ تم نے میرے کب کب کے جمع کیے کھلونے، میرے کھکھو گھوڑے اور بھس، بھرے جانور توڑ دیے تھے اور میں کتنا روئی تھی۔“

ایک شام جب وہ فارغ تھی اور گھر میں تھی اس نے بچوں کو ہوم ورک میں مدد دینے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد سکون سے بیٹھے بیٹھے سلمان کو یاد دلایا تھا۔

جواب میں سلمان نے خاموشی سے سر ہلادیا۔ مگر اس شام مرینہ نے پہلی مرتبہ سلمان کی نظروں میں کچھ ایسا دیکھا تھا جو ٹانوس تھا۔ شاید ان نظروں میں شکوہ تھا۔ کوئی یاد تھی، یا ایک شکست کا سا احساس۔ مرینہ کو سلمان کی وہ نظریں عرصہ تک نہیں بھولیں۔

”تم نے مجھ پر اتنی محنت کیوں کی سلمان؟“ ان نظروں سے گھبرا کر اس نے ایک بے نکا سا سوال پوچھا



رہی تھیں۔ یہ بات سن کر ادھر آگئیں ”سورۃ النساء کو آج رات ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرنا“ تمہیں خود ہی سمجھ میں آجائے گا کہ میل شاؤنسٹ کیا ہوتا ہے۔ ماچو مین کون ہے اور یہ ماں کا پھونکا ہوا ہے کہ خدائی حکم۔“

”واہ واہ“ مرینہ نے ان کی بات سن کر تالیاں بجائیں ”جہاں کسی بات کے حق میں کوئی دلیل نہیں سمجھ میں آتی وہاں قرآن پاک کی مثالیں دینے پر اتر آتے ہیں لوگ۔ میں آج جو بھی ہوں ناخالہ! آپ کی اور آپ کے بیٹے کی خواہشات کا عکس ہوں۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ آپ کو میرے کیریئر سے چڑ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اس دیو سی احمق سی لڑکی کی موت کا دکھ ہے جسے آپ جیسے چاہتی تھیں چلائی تھیں۔ کسی روٹ کی مانند جس کا ریموٹ کنٹرول آپ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ روٹ اسے مشینی کل پرزے اٹار کر جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ تو آپ کو خدا یاد آنے لگا اور خدائی احکامات بھی۔“

”ہمیں خدائی تو یاد تھا جو یوں چوں چرا کیے بغیر تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر اپنے گھر لے آئے تھے بنا یہ سوچے کہ تم ہمارے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ بھی کیاؤ گی یا نہیں۔“ خالہ چمکنے لگیں۔

”اور پھر اس احسان کی مارمارتے عمر گزار دینے کا عہد کیا۔“ مرینہ کا پارہ چڑھنے لگا تھا اور اسے بھول رہا تھا کہ وہ کس سے مخاطب تھی۔

”اور تم نکھر کر اسی خاندان کی بیٹی جس نے میری بہن کو خون تھکولایا۔“ خالہ نے ناجائز سنائیں۔

”میں بچہ، میرا خاندان بچہ، احسان فراموش، خود غرض، سفید خون۔“ مرینہ چلائی۔

”اب میں آپ کو ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ بچہ کیا ہوتا ہے۔ احسان فراموش، خود غرض اور سفید خون کسے کہتے ہیں۔“ اس کا دماغ اٹنے لگا۔ وہ پیسہ سلمان صاحب! جو آپ نے میری تربیت، اور تعلیم، پر لگایا، میں کما کر آپ کو واپس کر دوں گی۔ مجھے میری شخصیت واپس کر دیں۔ پلیز۔“

”ہماری شخصیت کو سنوارنے کے لیے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”وہ تو عام سی گریجویشن کے ساتھ بھی سنور جاتی۔ پروفیشنل ایجوکیشن دلوانے کا کیا مقصد تھا؟“ اس نے بحث کی۔

”ایسے کام بغیر مقصد کے اندھا دھند نہیں کیے جاتے مرینہ خانم!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”میں تو پوچھ رہی ہوں کہ کیا مقصد تھا۔“ ”ناکہ زندگی میں کسی بھی غیر متوقع کرائسس میں تم بے دست و پا نہ رہ جاؤ۔ تمہارے ہاتھ میں کچھ ایسا ہو جس کی بنا پر تم اپنی زندگی کو غیر محفوظ نہ سمجھو۔“ سلمان نے نھسر نھسر کر کہا۔ ”میں نے کچھ بھی پلاننگ کے بغیر نہیں کیا تھا۔“

”مگر تمہاری پلاننگ صرف ڈگری کے حصول تک کیوں رہی سلمان! اس سے آگے بہت آگے تک ہی تو اصل میدان تھا۔“

”میرا خیال تھا کہ امی کی تربیت اور گھر کا ماحول کم از کم میری زندگی میں تو تمہیں اس میدان کا اندازہ نہیں بننے دے گا۔ لیکن شاید یہ میری غلط فہمی تھی۔“ سلمان کے لہجے میں مایوسی اور اسی عود کر آئی تھی۔

”میل شاؤنسٹ!“ اس نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا ”سلمان خالہ! تم بھی اس معاشرے کے بہت سے ماچو مین macho man کی طرح لینڈ کرنے کے قائل ہو۔“

to be led by a lady کا کانسیٹہ تمہیں ہضم نہیں ہو پارہا۔ نہ ہی کبھی ہو گا۔ یو آر سپلی اے لماز بوائے

جو تمہارے کان میں وہ پھونکیں گی۔ تم وہی سوچو گے وہی کرو گے۔“

”کبھی قرآن کو ترجمہ سے پڑھنے کی کوشش کی تم نے۔“ خالہ جو ڈانٹنگ روم کی سائیڈ بورڈ میں برتن رکھ



”بات کو خواہوا الجھاؤ اور بڑھاؤ نہیں مرنے اور ای  
آپ بھی۔“ سلمان نے بات بگڑتے دیکھی تو کچھ کہنے  
کی کوشش کی۔ ”جو بات صالح صفائی صحبت پیار سے  
میشل ہو سکتی ہے اس پر جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت  
ہے۔“

مگر اس نثار خانے میں اس کی کون سننے والا تھا۔  
زندگی میں پہلی مرتبہ خالہ بھانجی کی تو تکار ہوئی جو رشتے  
ختم کر دینے پر توجہ ہو گئی۔



When we were kids we could  
not wait to grow up now  
that we grown up we realize  
that broken toys and wounded  
knees were better than broken  
hearts and wounded emotions

(جب ہم چھوٹے تھے ہمیں بڑے ہونے کا انتظار  
کرنا مشکل لگتا تھا۔ لیکن اب جبکہ ہم بڑے ہو گئے تو  
ہمیں احساس ہوا کہ ٹوٹے کھلونے اور زخمی کھٹے  
ٹوٹے دلوں اور زخمی جذبات سے بہتر تھے۔)

مرینہ نے سادے کاندھ پر لکھے یہ الفاظ اس عرصے  
میں کتنی بار پڑھے تھے اسے ڈھنگ سے یاد نہیں تھا۔  
یہ الفاظ اسے سلمان نے لکھ کر بھجوائے تھے اور  
جب اس نے انہیں پہلی مرتبہ پڑھا تھا۔ اسے احساس  
ہوا تھا کہ سلمان نے اسے اس روز والی بات کا جواب  
اب دیا تھا۔ وہ بات جو اس نے سلمان کے ہاتھوں اپنے  
کھلونے ٹوٹنے کو یاد کرتے ہوئے کی تھی۔ اور اسے  
یقین ہو گیا کہ اس روز بھی سلمان کی نظروں نے اسے  
ایسا ہی جواب دیا تھا۔

”ٹوٹے کھلونے اور زخمی کھٹے ٹوٹے دلوں اور  
زخمی جذبات سے بہتر تھے۔“

وہ ایک شاندار مستقبل کے حصول اور اپنی خدا داد  
صلاحیتوں کے مکمل اظہار کے لیے سلمان اور خالہ کا  
گھر چھوڑ آئی تھی۔ وہ سعدان اور تانیہ کو بھی چھوڑ

آئی تھی کیونکہ اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی بھی ایک اچھی  
ماں بن ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ انہیں سرور اتوں کے  
طویل انتظار سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ انہیں اس  
مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی جو اس کے ساتھ چلے  
آنے میں ان کا مقدر بن جاتی اس لیے اس نے اپنی  
ممتا کا گلا گھونٹ دیا۔

اس نے جو ایک نیا جہان دریافت کیا تھا اس کے  
کینوں نے اسے باور کروایا تھا کہ اسے اپنی خالہ کی  
1947ء والی سوچ اور سلمان کے میل شاؤنزم  
(مردانہ حاکمیت) سے نجات پا کر ہی اپنی صلاحیتوں کو  
آزمانے کا اصل موقع مل سکتا تھا۔ سو اس نے  
”عورت کے استحصال“ قسم کے سیمینارز سے جو سیکھا  
اور سمجھا اس کے تحت خود کو ان چاروں سے علیحدہ  
کر کے اپنا الگ تشخص بنانے کی نیکو دو میں مصروف  
ہو گئی۔

وہ بلاشبہ ذہین تھی اسے کام کرنا آتا تھا اسے علم کو  
مصروف میں لانے کا ہنر جانتی تھی اسی لیے جس  
مستقبل کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل آئی  
تھی وہ اس کے ہاتھ میں وقت سے پہلے آنے لگا تھا۔  
اس کی لگن اور جستجو پر موشن (ترقی) حاصل کرنے کی  
طرف مبذول ہو گئی تھی اور اس نے تھوڑے وقت  
میں کامیابیوں کے کئی جھنڈے گاڑ لیے تھے اس کی  
آمدنی بڑھی کثیر پیسہ ہاتھ آنے لگا لائف اسٹائل بدل  
گیا۔ وہ ایک اچھا لکڑی پارٹنر شازبیہ کے ساتھ  
شیر کرتی تھی ڈیرائزر کلاتھ پہنتی تھی۔ تھوڑے  
وقت کے بعد بیرون ملک کوئی ٹور اس کے ہاتھ آ جاتا وہ  
جس ایگزیکٹو سیٹ پر پہنچ گئی تھی وہاں آسائش اس  
کا مقدر بننے لگی تھیں۔ وہ اپنی نئی دنیا میں اتنی مصروف  
اور گرم ہو گئی کہ اسے کم ہی کبھی خیال آتا وہ پیچھے کیا  
چھوڑ آئی تھی۔

اس کی میل ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ حلقہ احباب  
وسیع ہو گیا۔ نئے نئے طبقہ فکر کے لوگوں سے تعلقات  
بن گئے اور اسے اکثر احساس ہوتا کہ ایک عرصے تک  
اس نے کیسی کنویں کے مینڈکوں جیسی زندگی گزاری



تھی۔ ایسے میں اسے بھول کر بھی کبھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اسے اس نئی زندگی تک انگلی پکڑ کر لانے والے کون لوگ تھے۔



”ہم نے سلمان سے ڈائورس (طلاق) کیوں نہیں لائی؟“ کینڈل لائٹ میں اس کے کم نمایاں چہرے کے مدھم سے خود خل کو دیکھتے ہوئے برہان نے کہا۔  
 ”ڈائورس۔“ مرینہ کے ہاتھ میں پکڑا کاٹیا فرایڈ پر ان کو کسی کمرہ گیک۔ ”میں کیوں لیتی اس سے ڈائورس؟“  
 ”کیوں لیتی دانی کیا بات ہے اس میں؟“ برہان نے دلچسپی سے اس کے رد عمل کو دیکھا۔ ”جب تم اس وجہ سے اسے چھوڑ آئیں کہ تمہارے اور اس کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی اور وہ اتنا کمزور تھا کہ زندگی کے ایک اہم معاملے میں تمہارا ساتھ تک نہ دے سکا تو پھر یوں اس کے ہم سے منسلک رہنے کا کیا مقصد ہے؟“

”مقصد؟“ مرینہ سے ایسا نیرنھا سوال اب تک کسی نے نہ پوچھا تھا۔ ”مقصد کچھ بھی نہیں۔“ وہ جیسے بڑبڑلاتی۔

”کیا سلمان اب تک یعنی ان تین سالوں میں بونٹی بیٹھا ہے۔ اس نے اپنا گھر دوبارہ نہیں بسایا؟“ سلمان نے ایک اور سوال کیا۔ یہ سوال بھی اب تک کسی نے مرینہ سے نہیں پوچھا تھا۔

”میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔“ مرینہ کو یہ سوال بھی چبھا تھا، وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ سلمان اس کے علاوہ بھی کسی اور لڑکی کو گھر میں بسا سکتا تھا۔ ”اس کی والدہ کے ہوتے ہوئے گھر میں کسی اور کی ضرورت کیا ہے۔“

”ایسا ممکن نہیں۔“ برہان مسکرایا۔ ”انسان کے فطری اور جبلتی تقاضے اسے گھر بسانے کی طرف لے جاتے ہیں ہم کن تصورات میں گم ہو؟“

اس نے یہ تو بھی سوچا ہی نہیں تھا اسے تو سلمان سے صرف علیحدگی چاہیے تھی۔ دنیا میں کوئی ایسا

فحص تو تھا نہیں جس کے لیے اس نے سلمان کا گھر چھوڑا تھا، اسی لیے اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ سلمان اپنے گھر کو جزا ہوا سمجھ کر کسی اور کو اس میں بسا لے گا۔

”اور اگر ایسا ہوا تو تمہاری فلیٹ کبڑا کیا ہوں گی؟“ برہان نے یہ سوال شاید دانستہ کیا تھا۔ مرینہ کے دل نے ایک دھڑکن مں کر دی۔ یقیناً اس لمحے کا اثر اس کے چہرے پر بھی آیا ہو گا۔ جب ہی برہان نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے اپنے ڈر تک کاٹکاس لبوں سے لگا لیا۔  
 مرینہ کا ذہن ایک نئی الجھن کا شکار ہو گیا، وہ تو اپنے تئیں سلمان کو ایک نہ ختم ہونے والے پچھتوے میں مبتلا کر دینا چاہتی تھی۔ وہ اسے اس دکھ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنی کمزوری اور اپنی ماں کی ضد کے ہاتھوں اسے گنوا دیا مگر برہان نے اسے ایک نئے وہم میں ڈال دیا تھا۔

اس نے برہان پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ ایک عمر امریکا میں گزارنے کے بعد لوٹا تھا، وہ تقریباً ”چالیس بیالیس سال کا ایک گرےس نل (بلوگر) مرد تھا۔ وہ اسی کمزور مہ سوسائٹی کا ایک پرکشش رکن تھا جس کے لیے مرینہ نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ برہان اسے ایک فیشن شو میں ملا تھا اور اسی پہلی ملاقات میں ان دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کی ایک نامحسوس فضا قائم ہو گئی تھی۔

دوسری ملاقات میچ کے گھر ہوئی تھی۔ برہان میچ کا پرانا دوست تھا اور مرینہ میچ کی کولیگ تھی۔ اس ملاقات میں برہان نے اسے اپنی زندگی کے مختلف تجربات، حادثات، کامیابیوں اور ناکامیوں کے قصے سنائے تھے۔ وہ کھرا بندہ تھا اور زبان و بیان پر عبور رکھتا تھا۔ مرینہ اس کی شخصیت سے متاثر ہونے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی جگہ ملے اور ذہنی ہم آہنگی بڑھنے لگی۔ یہ ان کی ساتویں ملاقات تھی جس میں برہان نے اسے آواری میں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ اس ملاقات میں پہلی مرتبہ مرینہ نے اسے اپنی کمائی سنائی تھی۔ گو اس کے بہت سے حصے وہ دانستہ حذف کر گئی تھی۔



”بنیادی انسانی حقوق کا حصول۔“ مارے بنیادیت کے مرید ان بنیادیت کو مکمل نہ کر سکی۔  
”حقوق کی تفصیل تو چٹاؤ ڈارنگ۔“ بہان کی نون اسے عجیب لگی۔

”بنیادی انسانی حقوق۔“ مرینہ نے اپنی بات دہرائی  
تھی۔ ”عزت احترام‘ رزق‘ محبت‘ معاشی‘ معاشرتی‘  
سماجی آزادی۔“

”مگر چہ تم روسو کے نظریات دہرا رہی ہو۔“ برہان نے اس کی بات کٹلی۔ ”مگر چلو پوئسی ہی سہی عزتِ احرام‘ رزق‘ محبت کی بات ہی کر لیتے ہیں۔ اگر یہ عورت کے بنیادی حقوق ہیں تو ان کے بدلے عورت کے فرائض کیا ہیں۔“

گھر کے اندر کی دنیا آباد کرنا۔ ”بے اختیار مرید  
کے منہ سے لفظ پھسلے ”مگر بے بنیادی حقوق ہی  
سب کر لیے جائیں تو پھر فرائض کا کیا ذکر؟ عورت  
کے حقوق کا استحصال ہی اسے گھر کے اندر کی دنیا سے  
باہر لے آتا ہے۔“ اس نے اپنی بات کو سنبھالا دینے کی  
کوشش کی۔

”تمہارے کون سے بنیادی حقوق سلب ہوئے تھے سوٹ ہارٹ! جن کی وجہ سے تمہیں گھر کے اندر کی دنیا سے باہر آنا پڑا۔“ برہان نے یقیناً چوٹ کی تھی۔ ”عزت، احترام، محبت اور رزق کسی چیز کی کمی بھی تمہیں؟“

”معاشی، معاشرتی، سماجی آزادی کا حق۔“ مرینہ

نے پہلی بار مضبوط لہجے میں کچھ الفاظ کہے۔  
 ”وہ مجھے ہاتھ باندھا غلام بنانا چاہتے تھے۔ موم کی  
 گزیا کی طرح مجھے موٹہ کرتے رہے۔ کبھی کسی شہب  
 میں کبھی کسی شہب میں۔ خود ہی کہتے رہے، خوب  
 رہو۔ میں نے بڑھتا شروع کر دیا تو کہنے لگے۔ گھر  
 جی بننے کا فن بھی سیکھو۔ میں نے ساتھ ساتھ وہ بھی  
 سیکھ لیا پھر جب بڑھے ہوئے کو استعمال کرنے کا وقت  
 آیا تو بولے۔ تمہیں پروفیشنل تعلیم تو کسی بھی  
 ایمر جیسی سے بچنے کے لیے دلوانی تھی۔ اصل کام اور  
 اصل مقام تو گھر میں ہے۔ پن میں کھڑے ہو کر

195



(مجھے افسوس ہے کہ تم سے سخت الفاظ میں بات کر رہا ہوں۔) مگر حقیقت یہ ہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے۔ میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے مرنہ! ہماری اس اعلا سوسائٹی کی ہر کامیاب کیریئر ویمن کے ساتھ ایک عدد ذاتی ناکامی یا شکست ضرور جڑی ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ گھر اور کام کے تقاضوں کا عدم توازن ہے۔ عورت بنیادی طور پر کیریئر بنانے کے لیے بنی نہیں، اسی لیے وہ کبھی ضرورت، کبھی شوق اور کبھی صرف خود کو ثابت کرنے کے لیے اس میدان میں کود پڑتی ہے تو اس کی زندگی کا میزان دس بیلس یعنی عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ توازن ایک بار اگر بگڑ جائے تو پھر اس کو واپس اس کی جگہ پر لے جانا محال ہوتا ہے۔ تم اگر کبھی عورت کے خمیر کے اجزائے ترکیبی پر غور کرو تو تمہیں یہ بات خود ہی سمجھ میں آجائے گی۔ عورت قربانی، ایثار اور مضبوط اعصاب کی سب سے بڑی مثال ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ

She is not ment for  
outdoor jobs

جب ہم قدرت کے زیریں اصولوں سے انحراف کرتے ہیں تو ہمیں کوئی نہ کوئی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے مگر تم تو اتنی بے خبر ہو کہ تمہیں اپنے نقصان اپنی ناکامی کا اور اک ہی نہیں۔

”تم بھی چنداں مختلف نہیں ہو ان مردوں سے جو اس معاشرے میں ازل سے عورت کے حقوق کی تشریح اپنی من مرضی کے الفاظ میں کرتے آئے ہیں اور اس کے فرائض کا چارٹر جگہ جگہ چسپاں کرتے پھرتے ہیں۔“

مرنہ کے پاس برہان کی بات کا اس کے سوا اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”کیا فائدہ تمہارے اتنا بڑے لکھے ہوئے کا اور ایک عمر امر کا میں گزار دینے کا جو تم نے بھی اپنے ہاتھ میں وہی میس شاید تنس کا ایجنڈا اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔“

”میں تجربات کی غلطی بھی سے گزرا ہوں سویت

دھڑا دھڑ جلتے چولہوں کے آگے کھڑے ہو کر ہانڈیاں بھوننے میں ہے۔ مرنہ! اس نے غصے سے کہا۔ ”نہ میرا کوئی من نہ میری کوئی مرضی نہ میری کوئی خواہش۔ کیا یہ بنیادی انسانی حقوق کے عین خلاف نہیں؟“

”بنیادی انسانی فرائض کے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟“ برہان اس موضوع سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ”تم اپنے چھوٹے چھوٹے بچے اس خیال سے پیچھے چھوڑ آئی ہو کہ تمہاری خالہ تم سے بہتر ان کی تربیت کر سکتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم سے اس سلسلے میں یہ نہیں پوچھا جانا چاہیے کہ تم نے سب سے اہم بنیادی انسانی فرض سے منہ کیوں موڑا؟“

مرنہ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئی، برہان نے اسے لا جواب کر دیا تھا۔

”اور اگر تمہاری خالہ اتنی ہی اچھی ٹرینر ہیں تو تم بھی تو ان ہی کی ٹریننگ میں رہی ہو۔ وہ تمہیں وہ کیوں نہ بنا سکیں جیسا وہ چاہتی تھیں؟“

مرنہ نے جواب سوچنا چاہا مگر فوری طور پر اس کے ذہن میں کوئی بات نہیں آئی۔

”اور اصل تم اس خیال سے انہیں پیچھے نہیں چھوڑ کر آئیں کہ تمہاری خالہ ان کی بہتر تربیت کر لیں گی بلکہ اس لیے چھوڑ آئی ہو کہ وہ تمہاری آزادی اور من مرضی کی راہ میں حائل ہو سکتے تھے۔ ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری تمہارے کیریئر کے لیے ایک مسئلہ بن جائے گی۔ تمہیں جو پُرکشش راستہ اس اعلا سوسائٹی نے دکھایا ہے اس پر چلنا تمہارے لیے محال ہو جائے گا۔ ہماری اعلا سوسائٹی کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ان کے چارٹر کا سب سے پہلا نکتہ اخلاقیات اور روایات کو گھلے سے اٹارنا ہے۔ وہ اپنے ممبرز کو بنیادی انسانی حقوق کا نعرہ لگاتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ ان کے ان حقوق کا استحصال ہو رہا ہے لہذا وہ اخلاقیات، روایات، مصلحت، مروت اور اپنی نفس میں پڑے ہوئے مذہب کا حقوق گھلے سے اٹار چھینکیں۔ مرنہ آئی ایم سوری ثانی سوارش اینڈ رپارڈ۔



بارت!“ برہان نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں نے امریکا میں رہتے ہوئے تین شادیاں کیں۔ ایک امریکن سے، دوسری ایک پاکستانی لڑکی سے اور تیسری ایک لبنانی لڑکی سے۔ تینوں کیریئر ویمن تھیں۔ ذہین، میدان مار لینے کی شوقین، اعلا سولتوں سے فیض یاب معاشرے کی ارکان۔“

وہ جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

”تینوں کا کچھ زبان، رہن سہن مختلف تھا مگر تینوں کی سوچ ایک سی تھی۔ پابندی، کسی بات سے منع کیے جانے اور بہتر طریقے سے گھر چلانے کی بات کسی طور برداشت نہ کرنے والی خواتین۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک کے بعد ایک میری تینوں شادیاں ناکام ہوئیں۔ تینوں سے میرے دو دو بچے تھے۔ تینوں نے ہی بچے میرے پلے ڈال دیے۔ نہ ڈالتیں تو بھی میں وہاں کے قانون کے مطابق بچوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کا پابند تھا۔ ان تینوں تجربات اور بہت سی دوستیوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ تعلقات میں خرابی کہاں پیدا ہوتی رہی۔ میں نے اپنا محاسبہ بھی کیا اور ان کا تجزیہ بھی۔ یقین جانو کہ مجھے دیانت داری سے دیکھنے کے بعد اپنا قصور بہت کم نظر آیا کیونکہ میں تو اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہا تھا۔ میری نیت بھی خراب نہیں تھی۔ میرے تجزیے نے مجھے یہ بتایا کہ سارا مسئلہ ہی عورت کے اپنے عورت ہونے کا قاعدہ نہ اٹھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی مردوں کی طرح جینا چاہتی ہے اور مرد کی طرح جینے کے لیے گھر سے باہر زیادہ وقت گزارنے کو ترجیح دینے لگتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ مرد کی طرح جینے کی خواہش میں اس کی ذمہ داریاں دہری ہو جائیں گی۔ اسے دو جگہ ڈیوٹی دینا پڑے گی۔ اس کی یہ بھول زندگیوں میں عدم توازن لے آتی ہے۔ نہ وہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔ اپنی جان کو بھی جو کھوں میں ڈال دیتی ہے اور اپنے سے متعلقہ لوگوں کی بھی۔ اس تجزیے کے بعد مجھے اپنا خدا بہت یاد آیا۔ اس کی خدائی اور اس کے بتائے راہ نما اصول بھی سمجھ میں آنے لگے۔

میں پاکستان واپس آیا اور اپنے چچا کی بی بی اے پاس عام سی لڑکی سے شادی کر لی۔ میں ایک تجربہ یہ بھی کرنا چاہتا تھا تاکہ میرے ذہن کی گتھیاں پوری طرح سلجھ جائیں۔ یہ عورت کیریئر بنانے کے لالچ میں نہیں پڑی۔ شادی سے پہلے وہ ایک اسکول ٹیچر بھی مگر شادی کے بعد اس نے جاب چھوڑ دی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ایک گھر بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا اور حیرت انگیز طور پر میں ایک پرسکون اور من چاہی زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے گھر کے نظام میں توازن ہے، میرے دو صحت مند اور زندگی سے بھرپور بچے ہیں۔ میرے پہلے بچوں سے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کتیس برسہ کر تو اتنا مضبوط اور صحت مند۔ مرینہ بی بی! میں نے اپنی زندگی کے تجربات سے خدائی احکامات کے سچے اور کامل ہونے کی حقیقت جانی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عورت جس کے وجود سے کائنات میں رنگ ہے اسی کے وجود سے کائنات کا سارا توازن اور عدم توازن والا کھیل چلتا ہے۔ اس معاشرے میں ضرورت نہ ہونے کے باوجود کیریئر بنانے والی خواتین کی اکثریت کی ذاتی زندگیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ اسی عدم توازن کا ہونا ہے۔“

”جبکہ اسی معاشرے کے اسی فیصد مرد شادی کرنے سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکی بڑھی لکھی اور برسر روزگار ہے کہ نہیں؟“ مرینہ نے سخی سے کہا۔

”یہ مردوں کی بھی حماقت ہے۔ ایسا کرنے والے مرد بھی زندگی میں نقصان سہتے ہیں۔ گھر اور خاندانی گھریلو کامزائ بھی چکھ نہیں پاتے۔“ برہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ اللہ نے بڑے واضح الفاظ میں مرد و زن کے اس دنیا میں فرائض متعین کر دیے ہیں۔ ناگزیر حالات کی اور بات ہے، ورنہ ان دونوں مخلوقات کو اپنے اپنے فرائض اور حقوق کی پاس داری کرنا از حد ضروری ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی روگردانیوں سے ہی تو بڑے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے مسائل کی عفریت کا اجتماعی شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے اور سلمان یا

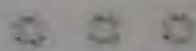


تمہاری خالہ کے نکلیات اور سوچ کے اس عکاز سے  
سب سے زیادہ ایک تیسرا فرق متاثر ہو رہا ہے۔  
"تیسرا فرق" مراد سننے پر تکرار کرنا۔

مگر یہ کتنی کی بات یہ ہے کہ تمہیں تیسرا فرق  
سے واقف ہی نہیں ہو۔ وہ تیسرا فرق تمہارے بچے  
کیا نہیں یقیناً تمہاری خالہ یا شاید تمہارا امی یا بھی  
یہ حالت دیتے ہو کہ ان کی مائیں یا بیویاں کے لیے  
انہیں کچھ تصور رکھیں۔ مثلاً کہ ان کی "خوش" میں  
ان کا وہی قصہ نہیں انہوں نے ان کی کہانی سے بھی محروم  
ہوئے اور اس کے حوالے سے انہوں نے کچھ بھی  
ہوئے ان کی شخصیات، صورتیں وہ ہائیں کی بجائے  
ان کتاب پر مبنی ہیں جو ان کے آواز و حالات  
کا ترجمہ جاسا گیا ہو سکتا ہے۔ یہ دیکھ سوجھتے نہیں کہ  
ان کی مائیں جس طرح خواہشات کے حصول کے لیے  
قرار حاصل کرتی تھیں ان کی مائیں سے ان سال لاکھ ہائی بہتر  
ہے۔

یہ وہ نکتہ تھا جس سے مراد قرار حاصل نہیں  
کر سکتی تھی۔ اس کا حلقہ برہنہ اس کے جذبات  
سے تھا۔ وہ یہاں کوئی تپا تپاتی تھی کہ اس نے اس نکتے  
پر سوچا تھا بہت سوچا تھا۔ بچوں سے جدا ہو جانے کے  
بعد ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کون سی نعمت ہاتھ سے  
گنوا بیٹھی تھی مگر خواہش کے باوجود وہ ان سے رابطہ  
کرنے کی ہمت نہ کر پاتی تھی۔

"خود اگر وہ نوازا گیا یعنی تمہارا شوہر اور تمہارے  
وہ نہیں تھے تمہارے بغیر بھی خوش ہیں تو اس سے بیحد  
کرنا لگی تم کیا یہ قصہ کی مراد؟" یہاں کی بھاری ہوئی  
تو اس کے کان میں پڑی۔



"بنتو لڑا جی۔" ایک دن اور ایک رات ایسی  
بیترہنہ بھولنے اور بہت سے تجزیے کرنے کے بعد  
اس نے سوچا تھا۔ "کیسی قسمت والی عورت تھی۔"  
یہ اس کا تازہ ترین فیصلہ تھا۔ "ہاں مائیں پر بھی وہ آواز  
بھی تم کے اچانک پھانک، ابھی چار چھٹیاں رکھ کر

یہاں کھائی ہوئی پیسے اس پر منور ہوئی اور وہ۔ کھانا  
یہاں ختم ہو گیا۔ ختم سے فکر بھاری ہوئی جیسے کسی  
انجینئر کو نہایت سے فکر ہوئی ہو۔

اپنے تخت کھڑے باقیوں سے سرکھٹ کی  
تکیوں پر اور رنگ رنگ کھڑکیوں کو قریب کھینچیں  
وہ مائیں عظیم ترشت مائیں کے لیے تھکے ہوئے  
کر خواہشات کی بجلی پناہ گاہ میں پائنتی ہوئی ایک  
عظیم فن کی مین۔

وہ عورت جس کی قسمت میں اتنی محنت کے باوجود  
جیت کی ہوا کہ اپنے کھانا اور چارچوٹ کی ہمارے مگر  
جو پھر بھی اپنے اند کی اس طرح فکر گزار رہی تھی  
جیسے اسے کلاس سولیات سے مزین زندگی گزار رہی  
ہو۔ وہ عورت جس نے خدا کا اہم نہیں پا کر کچھ تھا  
اسے پناہ نہیں ملتی تھی مگر اس کی سطر سطر انگلی رگوں  
پر یہ بھی جلی سے یہ بھی جلی ہے "کی گردان کرنا  
بھوتی تھی کیونکہ اسے اپنے خدا کی خدایت اور سچائی کا  
کی جان سے چین تھا۔

"بنتو لڑا جی۔" مراد نے اپنی دند سولی ہوئی  
مکھنیں بھٹک کر کہیں "اس کے" "نیلے" "نیلے"  
رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھیں عورت جس نے  
عورت کے حقوق کا چارٹر نہیں پڑھا تھا مگر جسے  
ایک سبق اچھی طرح یاد تھا کہ رب راضی رکھنے کے  
لیے اپنے ہر حال میں صبر بھی کرنا ہے اور فکر بھی کرنا  
ہے۔ جو لوگوں کے کہنے پر بھرتی نہیں تھی جسے  
عورت اور مرد کے مقام کی پہچان تھی جو اپنے فعل کی  
جواب دہ تھی اسے اپنے ساتھ لڑائی کرنے والوں کے  
انہوں سے کوئی سودا کر نہیں تھا۔ خدا نے تو صرف اس  
سے پوچھا تھا کہ "تو نے کیا کیا؟"

"تو نے کیا کیا؟" جیسے سوال کے تصور سے ہی  
کلب کلب جاتی تھی اور یہی تصور اس سے ہاس کی  
تکیوں کے چھانچ کرے اور کھولنے بنوائے جاتا  
تھا۔ مٹی گوندھ کر کھلو کھولے بنوا کر اس میں رہائے  
جاتا تھا۔ کلی کلی مچھم کر اپنی اشیاء بیچنے والی پریشانی  
وہیں جس کے سر پر ہر طرح کی ذمہ داریاں تھیں جو



نوں کی طرح بھتی ہے کیونکہ تمہارے سب کچھ بڑھ گیا،  
بڑی بڑی کتابیں لکھنے اور نئے نئے کتابے لکھنے کے لیے  
تمہارے صبر کا اور شکر کا مقام کبھی نہ جانا خدا کے کلام کو  
حلق میں رکھ دو اور بھول کر بھی کبھی نہ کہہ کر دیا کہ وہ  
حق ہے اور وہ سچ ہے۔

بنیادی انسانی حقوق کے نعرے بلند کرنے والی  
کامیاب کیریئر ویمن! بنیادی انسانی حقوق کے سبق  
والی قائل تم نے سب کر کے رکھا روم میں رکھا اور  
ماکہ تمہاری نسلوں تک کو بتا چل سکے کہ وہ کون سے  
اسباق تھے جن کے وردنے ان کے اسلام کو عزت  
بخشی۔ تم جتنے چاہے سرٹیفیکیشن آف ایکسیس  
حاصل کر لو۔ ایوارڈ جیت لو، شیلڈز اٹھا لو اور میڈلز  
پس لو۔ تم تاحیات رہو گی ایک پاکام عورت ہی  
کیونکہ تمہارے نہ ہونے سے زندگی کی اس تصویر  
میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس نے ساری دنیا پر رکھی اس تصویر کو دکھا جس  
میں کل اسے خدا سا نظر آیا تھا۔ وہ ٹریڈ مارک تھا اسے  
کھل ہی رہا تھا کیونکہ اس کی بنیاد اس عورت نے  
رکھی جو دنیاوی تقاضوں سے واقف تھی اور خدائی  
احکام سے بھی۔

اسے اپنی خالہ کا چہرہ یاد آیا جو اسے بھی ایک پڑھی  
لکھی کامیاب مگر گھروار عورت بنانا چاہتی تھیں جو  
اس کے ذمے اپنی نسلوں کی تربیت کا فرض سونپنا چاہتی  
تھیں جو۔

Give me a good mother  
you a successful  
i will give  
generation.

(مجھے ایک اچھی ماں دو، میں تمہیں ایک کامیاب  
نسل دوں گا) کے مقولے کو ماننے والوں میں سے  
تھیں۔

”کتنے رنگ ہیں عورت تیرے۔“ اس نے سوچا۔  
”بنو اوڈھنی“ خالہ اور مرثہ سلیمان۔ ”کون سا رنگ  
ہے جو کامیاب ہے اور مقبول بھی۔ محترم بھی اور

نظر سے ضرورت کے تحت گھر سے نکلتی تھی مگر اسے خود  
کو گھر سے نکلنے پر مجبور کرنے والے سے کوئی جگہ نہیں  
تھا، جب ہی وہ اسے پکار کر بھی دیتی تھی اور اس کے بچے  
بھی پیدا کر لیتی تھی۔ اسے اپنے اور اس کے مقام کے  
فرق کا اور اک تھا اور اسے یہ بھی اور اک تھا کہ اس  
کے رب نے اس کے خلود کے اعمال کے بارے میں  
اس سے نہیں پوچھا ہے۔ اس کے اپنے اعمال کے  
بارے میں پوچھا ہے۔

”بنو“ ”نہی“ ”بنو“۔ ”مرثہ“ نے آنسوؤں سے بھیگی  
نظریں اپنے ارد گرد دوڑائیں۔ اس کے ارد گرد بھی  
رنگ تھے، سرخ، نیلے، پیلے، ہرے، نیلے، نیلے، نیلے  
رنگوں میں بنے والی عورت ”بنو اوڈھنی“ کے مرتبے  
کو کبھی چھو نہ سکتی تھی کیونکہ اسے بنو کے فلسفہ  
حیات کی سمجھ ہی بہت دیر سے آئی تھی۔ اسے صبر کا  
مرتبہ اور شکر کا مقام اب سمجھ میں آیا تھا۔ وہ اپنے  
تین اپنے حقوق سے لطف اندوز ہونے کے لیے قرابتی  
رشتوں کو چھوڑ لیتی تھی۔ اس شخص کو میل سٹوڈنٹ  
اور ماہرین کا خطاب دیتی رہی تھی جس کی مرہون منت  
اس کی ساری زندگی اس کا لپنسٹ اور ذہانت تھی۔ وہ  
خود کو منوانا اور سلمان کو ایک دائم پچھتوے میں مبتلا  
کر دینا چاہتی تھی مگر اس روز ”جامن چلا“ سے باہر  
نکلنے سے مسکراتے چہروں پر کوئی پریشانی، کوئی محرومی  
نہیں تھی۔ وہ ٹریڈ مارک خوش باش تھا جبکہ وہ ایک بہت  
بڑی خطی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ بہان کی باتیں اس  
کے دل کو لگی تھیں اور اس روز اچانک ”بنو اوڈھنی“  
کی یاد نے اس کی خواہشات کی دنیا میں آگ لگا ڈالی  
تھی۔

”فیشن دیوا“ اس نے اپنے پورٹریٹ پر ایک نگاہ  
غلط ڈالی۔ ”تم جانتی ہو کہ تمہارے بچے سبائے خوش  
باش چہرے پر تمہاری ذاتی زندگی کی ناکامی کا تاثر کتنا  
واضح نظر آتا ہے۔ تم دس ہزار فور مزیں کھڑی ہو کر بڑی  
بڑی باتیں کرو، سوشل آکٹائیو، ٹیڈ سیکرز، افراط زر،  
بیننس آف منی، اقتصادی ترقی اور نجانے کیا کیا۔  
تمہاری ذاتی ناکامی کی شکست تمہاری ہر بات میں انداز



ایوارڈونگ بھی۔

کتنی کیریر ویمن بنتو کے فلسفہ حیات کو سمجھ کر اپنا مقام جاننے کا شرف حاصل کر سکتی تھیں۔ یہ شاید اسے کبھی پتا نہیں چل پاتا تھا مگر خود اس کو شاید کبھی کسی کی دی ہوئی دعا لگ گئی تھی یا اسے وہ خلا نظر نہیں آیا جو اس کے چلے آنے کے نتیجے میں سلمان اور بچوں کی زندگی میں آنے والا تھا۔

وہ سلمان کو گھٹنوں کے بل جھکانے کی خواہش میں مبتلا تھی اور خالہ کو پچھتاوے میں مبتلا کرنے کی مگر اسے اچانک اور اک ہوا تھا کہ وہ لاشعوری طور پر جس دستک کی منتظر تھی وہ اس دروازے پر کبھی نہیں ہوگی بلکہ اس کا وجود اس کے بچوں کے لیے شرمندگی اور خجالت کا باعث بننے والا تھا۔ ایک کے بعد ایک انگشت اس کے فتم پر ہونے لگا تھا اور اس کے اندر کی کیریر ویمن کی عقل مات کھا گئی تھی۔ اسے بنتو اوڈھنی کا پروفا کل اپنے سے کہیں بستر نظر آنے لگا تھا۔ بہان احمد نے اس کے دماغ پر جو دستک دی تھی اس نے اس پر معنی کے کئی دروازے کھول دیے تھے اور اس ایک بڑی اکاؤنٹنٹ نے بیلنس آف ریپنس ہلٹیز (ذمہ داریوں کا توازن) کے زیر اصول سمجھ لینے کے بعد کیریر کو خدا حافظ کہنے کی ٹھانی لی تھی۔ یہ مکمل شکست تھی، بقا تھی، قربانی تھی یا دائمی خوشی اور دل کے سکون کے حصول کی طرف ایک پیش قدمی۔ اس نے اپنی احسان فراموشی کے عمل کا کفارہ ادا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

عمران ڈاٹ جیسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایم ایچ سس

آب روحتوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران ڈاٹ جیسٹ، ۳۴ اردو بازار کراچی

اسے بنتو کا وجود ملاک نمبر 1 پر کھڑا نظر آیا۔ اسے یہ مقام صبر اور شکر کے فلسفے اور اپنے عمل کی جواب دہی کا اور اک رکھنے پر ہی ملا تھا اور دوسرے نمبر پر یقیناً خالہ تھیں مگر تیسرے نمبر پر اسے اپنا وجود نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے عورت ہونے کو فنا کر کے مردوں کے شانہ بشانہ چلنے والوں میں سے تھی۔ عورت کی دنیا میں اسے کوئی مقام کیسے مل سکتا تھا۔ اسے یاد آیا اور اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔

Wounded knees and broken toys were better than wounded emotions and broken hearts  
(زخمی گھٹنے ٹوٹے دلوں اور زخمی جذبات سے بہتر تھے)

اس کے دل نے چلا کر کہا۔ ”وہ کتنے دلوں کو توڑنے اور کیسے جذبات کو زخمی کرنے کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا مگر وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک لخت اس نے اپنے دماغ میں آویزاں عورت کے حقوق کی تشریح کرنے والے چارٹر کو نوچ کر اتار پھینکا۔ اب اسے طلاق میں رکھے کلام پاک کو نکالنا تھا اور یقیناً کامل کرنا تھا کہ اس میں لکھا سب حق اور سچ ہے اور پھر اسے واپسی کا راستہ ڈھونڈنا تھا۔ اس نے اپنے سرکنڈوں کی تیلیوں سے بنے کھلونے اور گھگھو گھوڑے سمیٹ کر ٹوکری میں ڈال دیئے تھے کیونکہ اسے اپنا علم و ہنر بیچ کر روپیہ کمانے کی حاجت نہیں تھی۔

اسے اپنا یہ فن اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کرنا تھا۔ انسانی حقوق کا پرچار کرنے والی اور خواتین کے استحصال کی کہانیاں سنانے والی اس کی آئیڈیل شخصیت کی جگہ یک لخت اس تصویر کے چوکھٹے میں بنتو اوڈھنی کا چہرہ فٹ ہو گیا تھا کیونکہ دیر سے ہی سہی مرینہ کو اس کا فلسفہ حیات سمجھ میں آ گیا تھا۔

دادو تحسین کے ڈو ٹکری سمیٹنے والی ایوارڈ اور میڈلز جیتنے والی بڑے بڑے فورمز پر ریویوز پڑھنے والی